شریف زادہ
مرزا ہادی رسوا
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

Shareef Zada
by
Mirza Ruswa
Rs.62/-

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ 110025 ☎ 011-26987295
Email: monthlykitabnuma@gmail.com

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی ۔ 110006 ☎ 011-23260668
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی ۔ 400003 ☎ 022-23774857
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۔ 202002 ☎ 0571-2706142
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ 110025 ☎ 011-26987295

قومی اردو کونسل کی کتابیں مذکورہ شاخوں پر دستیاب ہیں

سنہ اشاعت: 2011 تعداد: 1100 قیمت: -/62 روپے
ISBN:978-81-7587-543-2 سلسلۂ مطبوعات: 1449

ناشر: ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو 110025
فون نمبر: 49539000 فیکس: 49539099
ای میل: urducouncil@gmil.com ویب
طابع: جے۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرز، بازار مٹیا محل،
اس کتاب کی چھپائی میں NPL Maplitho

معروضات

قارئین کرام! آپ جانتے ہیں کہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جو اپنے ماضی کی شاندار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ 1922ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو زمانے کے سرد وگرم سے گزرتا ہوا آگے کی جانب گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں، نامساعد حالات سے بھی سابقہ پڑا مگر سفر جاری رہا اور اشاعتوں کا سلسلہ کلّی طور پر کبھی منقطع نہیں ہوا۔

اس ادارے نے اردو زبان و ادب کے معتبر و مستند مصنّفین کی سیکڑوں کتابیں شائع کی ہیں۔ بچوں کے لیے کم قیمت کتابوں کی اشاعت اور طلبا کے لیے ''درسی کتب'' اور ''معیاری سیریز'' کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی تیاری بھی اس ادارے کے مفید اور مقبول منصوبے رہے ہیں۔ ادھر چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ تعطل پیدا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے فہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف پگھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کمیاب بلکہ نایاب ہوتی جارہی تھیں شائع ہو چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اب تمام کتابیں مکتبہ کی دلی، ممبئی اور علی گڑھ شاخوں پر دستیاب ہیں اور آپ کے مطالبہ پر بھی روانہ کی جائیں گی۔

اشاعتی پروگرام کے جمود کو توڑنے اور مکتبہ کی ناؤ کو بھنور سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیئرمین اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر جناب نجیب جنگ (آئی اے ایس) کی خصوصی دلچسپی کا ذکر ناگزیر ہے۔ موصوف نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے فعّال ڈائرکٹر جناب حمید اللہ بھٹ کے ساتھ (مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے درمیان) ایک معاہدے کے تحت کتابوں کی اشاعت کے معطّل شدہ عمل کو نئی زندگی بخشی ہے۔ اس سرگرم عملی اقدام کے لیے مکتبہ جامعہ کی جانب سے میں ان صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ یہ تعاون آیندہ بھی شاملِ حال رہے گا۔

خالد محمود

منیجنگ ڈائرکٹر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

مجلسِ ادارت

حرفِ آغاز

پُرانی کتابیں کم یاب ہوتی جارہی ہیں۔ جو کتابیں ملتی ہیں، اُن میں سے بیش تر قابلِ اعتبار نہیں۔ عام طور سے اُن کی قیمتیں بھی زیادہ ہوتی ہیں اور بہت سے لوگ جو اچھی کتابوں کو خریدنا چاہتے ہیں، قیمتوں کی زیادتی کی وجہ سے نہیں خرید پاتے۔

اِن امور کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، مکتبہ جامعہ نے، حکومتِ جمّوو کشمیر کے تعاون سے ایک نیا سلسلہ شروع کیا ہے جس کے تحت قدیم معیاری کتابیں، صحتِ متن اور حُسنِ طباعت کے ساتھ پیش کی جائیں گی۔ ان کتابوں کا متن بہت اہتمام کے ساتھ تیار کیا جائے گا جو اس کتاب کے معتبر ترین نسخے پر مبنی ہوگا۔ صحّتِ متن کے ساتھ ساتھ صحّتِ اِملا کا بھی بہ طورِ خاص لحاظ رکھا جائے گا۔ اور یہ ساری کتابیں آفسٹ پر نہایت خوب صورتی کے ساتھ چھاپی جائیں گی۔ اس کے باوجود ان کتابوں کی قیمتیں کم سے کم ہوں گی۔ اور اس کے لیے مکتبہ جامعہ حکومتِ جمّوں وکشمیر کا ممنوع ہے جس کی مالی امداد نے اِس بات کو ممکن بنایا۔

ہمیں امید ہے کہ حکومتِ جمّوں وکشمیر کی مالی امداد سے مرتّب کیا ہوا کتابوں کا یہ سلسلہ اردو زبان وادب کے فروغ میں اور اچھی کتابوں کی زیادہ سے زیادہ اشاعت میں بے حد معاون ثابت ہوگا۔

شاہد علی خاں
(جنرل منیجر)

تعارف

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں جن دیو قامت شخصیتوں نے اردو زبان میں اپنے کارنامے یادگار چھوڑے ان میں مرزا محمد ہادی رسوا کا نام بھی نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ وہ بڑی ہمہ جہت اور ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے علم و فن کو وہ ایک اکائی تصور کرتے تھے اور اس میں مشرق و مغرب، جدید و قدیم یا کسی دوسرے امتیاز کے قائل نہ تھے۔ انکی ذات میں بیک وقت حکیم، سائنسداں، انجینیر، واعظ، رند، عاشق، شاعر اور ناول نگار کی صفات اور صلاحیتیں جمع ہو گئی تھیں۔ اگرچہ اردو کے عام قارئین انھیں ایک باکمال ناول نگار کی حیثیت سے ہی جانتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ فلسفہ، علمِ ہیئت، شعریات، مذہبیات، ڈرامہ اور شاعری میں بھی انکی تصانیف اور تخلیقات انکے تبحرِ علمی، اور اعلیٰ تخلیقی جوہر کی آئینہ دار ہیں۔ اسکے علاوہ ایک کامیاب مترجم کی حیثیت سے بھی انکی خدمات قابلِ قدر ہیں۔

مرزا رسوا کا اصل نام مرزا محمد ہادی تھا۔ شاعری میں مرزا تخلص کرتے تھے مرزا رسوا کو پہلی بار انھوں نے اپنے ایک ناول 'افشائے راز' میں، جو ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا، ایک افسانوی کردار کی حیثیت سے متعارف کرایا تھا اور قارئین کو یہ باور کرایا تھا کہ وہ میرے یعنی مرزا محمد ہادی کے دوست ہیں لیکن اسکے بعد جب ۱۸۹۹ء میں انھوں نے اپنا ناول 'امراؤ جان ادا' اور ۱۹۰۱ء میں 'ذاتِ شریف' اور 'شریف زادہ' تصنیف کیے تو اپنے اسی تخلیق کیے ہوئے کردار کو انھوں نے ان ناولوں کا مصنف بنا کر پیش کر دیا۔ اس طرح اپنے آپ کو پردے میں رکھنے کی کوشش کی لیکن صرف ناولوں کی حد تک۔ اپنی دوسری تصانیف اور شاعری میں وہ اپنا نام مرزا محمد ہادی مرزا ہی لکھتے رہے۔

مرزا محمد ہادی (رسوا) ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ کے ایک علم دوست اور معزز گھرانے

میں پیدا ہوئے۔ انکے اسلاف مغلیہ دور میں ماژندران سے دہلی آئے اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ جب دہلی کی سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا تو آصف الدولہ کے عہد میں لکھنؤ آکر آباد ہوگئے۔ مرزا کے والد آغا محمد تقی ایک علم دوست اور شریف النفس رئیس تھے۔ انکی شادی نواب احمد علی خاں عرف آغا شیر کی صاحبزادی سے ہوئی تھی جو کئی گاؤں جہیز میں لائی تھیں۔

مرزا رسوا کی عمر مشکل سے پندرہ سولہ سال کی ہوگی کہ انکے والدین چل بسے۔ ایک چھوٹا بھائی تھا وہ بھی داغِ مفارقت دے گیا۔ اب انکی خالہ اور رشتے کے ایک ماموں نے انکی پرورش کی ذمہ داری لی لیکن دراصل اس بہانے انھوں نے مرزا کی موروثی جائداد پر قبضہ کر کے اسے خورد برد کر دیا۔ ایک دو مکان بچے تھے بالغ ہو کر انہیں فروخت کر کے مرزا گزر بسر کرتے رہے۔

علم و ادب سے گہرا شغف مرزا کو ورثہ میں ملا تھا۔ فارسی، حساب، اقلیدس اور بعض دوسرے علوم کی ابتدائی تعلیم مرزا نے اپنے والد سے ہی حاصل کی۔ انگریزی خود اپنے شوق سے پڑھی۔ والدین کی وفات کے بعد بھی مرزا نے سلسلۂ تعلیم جاری رکھا لیکن دراصل انکی زندگی کا یہ دور بے فکری، آزادی، رنگینی اور سرشاری کا دور تھا۔ اس زمانے میں وہ چھیلوں کی طرح رہتے اور بانکوں جیسی زندگی بسر کرتے تھے۔ اربابِ نشاط کے کاشانوں کی سیر بھی کرتے۔ دوستوں کے ساتھ خوب دادِ عیش دیتے۔ موسیقی اور شاعری کے رسیا تھے۔

یہ راہ و روش دیکھ کر انکے کچھ بزرگوں نے فیض آباد کے ایک شریف گھرانے میں انکی شادی کر دی۔ اس سے ایک بچی پیدا ہوئی لیکن دو سال کے اندر ہی بیوی اور بچی دونوں کا انتقال ہوگیا۔ اب مرزا نے پرائیویٹ طور پر میٹرک کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ انجینئرنگ کی تعلیم کیلئے انھیں رڑکی انجینئرنگ کالج میں داخلہ مل گیا۔ اس کورس کی تکمیل کے بعد اوورسیر کی حیثیت سے کوئٹہ میں ان کا تقرر ہوگیا۔

کوئٹہ میں وہ دو ڈھائی سال کی مدت سے زیادہ نہیں رہے۔ یہیں کے دورِ قیام میں انھیں علم کیمیا کے مطالعہ کا شوق ہوا اور وہ ملازمت ترک کر کے وطن واپس آگئے۔ گزر اوقات

کے لیے مشن کالج نخاس میں فارسی کے استاد کی حیثیت سے ملازمت کرلی اور کیمیا کے تجربے کرنے لگے۔ اس سے جی بھر گیا تو حکمائے یونان کے مطالعہ کا جنون ان پر طاری ہوا۔ مئی ۱۸۸۶ء میں "اشراق" نام کا ایک رسالہ جاری کیا جسکا مقصد حکیمانہ خیالات کی اشاعت تھا۔ کم و بیش ڈیڑھ سال تک یہ رسالہ نکلتا رہا۔

۱۸۸۷ء میں مشن کالج گولہ گنج میں عربی اور فارسی کے استاد کی حیثیت سے مرزا رسوا کا تقرر ہو گیا۔ تنخواہ میں بھی اضافہ ہوا۔ امین آباد کے قریب انھوں نے ایک خوبصورت بنگلہ تعمیر کرایا اور عقد ثانی کر کے سکون کی زندگی بسر کرنے لگے۔ اس زمانے میں شعر و شاعری مرزا کا خاص مشغلہ تھا۔ لڑکپن میں وہ مرزا دبیر کے شاگرد ہوئے تھے۔ انکی وفات کے بعد انکے صاحبزادے مرزا اوج سے اصلاح لیتے رہے۔ غزل اور مثنوی مرزا کی پسندیدہ اصناف تھیں۔ لیکن اسی زمانے میں 'مرقع لیلے مجنون' کے نام سے ایک مکمل اور منظوم ڈرامہ لکھ کر انھوں نے اپنی قادر الکلامی کا سکہ جما دیا۔

مرزا رسوا کی طبیعت میں سیمابیت اور مذاق میں تنوع تھا۔ کسی ایک مقام، ایک مشغلہ اور ایک موضوع سے دیر تک وابستہ رہنا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔ دس بارہ سال کی مدت میں انھوں نے کم از کم چار بار اپنی جائے رہائش بدلی۔ کچھ دنوں علم موسیقی کا شوق رہا اور پھر اسے ترک کر کے علم ہیئت کے مطالعہ میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ اس مقصد کیلیے انھوں نے سنسکرت زبان سیکھی۔ کئی آلات اور اصطرلاب خود بنائے۔ یہ انہماک اتنا بڑھا کہ کالج سے چھ ماہ کی رخصت لے لی علم ہیئت پر کئی مقالات لکھے اور ایک زیچ بھی تیار کی۔ ۱۹۰۳ء کے بعد مرزا مذہبی لٹریچر کے مطالعہ میں غرق ہو گئے۔

اگست ۱۹۱۹ء میں مرزا رسوا حیدر آباد (دکن) چلے گئے اور وہاں دار الترجمہ میں ۴۵ روپیہ ماہانہ کے ملازم ہو گئے۔ قیام حیدر آباد کا زمانہ نسبتاً سکون سے گذرا اور وہ ترجمہ کے کام میں مصروف رہے۔ فلسفہ، نفسیات اور بعض دوسرے سماجی علوم کی متعدد کتابیں مرزا نے

انگریزی سے اردو میں منتقل کیں۔ آخر ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو ٹائیفائڈ کا شکار ہو کر رحلت کی۔

جیسا کہ ذکر آچکا ہے مرزا رسوا نے سماجی علوم اور طبیعی علوم کے مختلف موضوعات پر اپنی تصانیف اور تحریریں یادگار چھوڑی ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ اردو میں انکے ناول ہی انکی شہرت اور مقبولیت کا باعث ہوئے۔ امراؤ جان ادا کا نہ صرف ہندوستان کی بلکہ دنیا کی متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ انکا دوسرا اہم ناول شریف زادہ ہے جو پہلی بار ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا فنی نقطۂ نگاہ سے نذیر احمد کے ناولوں کی طرح اس میں بہت سے نقائص ہیں۔ اسکا پلاٹ غیر دلچسپ اور میکانکی ہے۔ اسکے بیشتر کردار بھی مثالی اور بے جان ہیں۔ اسکے باوجود یہ ناول اردو کے اُن چند ناولوں میں سے ہے جنہوں نے بیسویں صدی میں متوسط طبقہ کے اُردو داں نوجوانوں کی سیرت کو متاثر کیا ہے کم و بیش نصف صدی تک ہائی اسکول اور اردو کے بعض دوسرے نصابات میں شامل رہا۔ نذیر احمد کے ناول 'مراۃ العروس' کی طرح ہر گھر میں اِس کا مطالعہ لازمی خیال کیا جاتا رہا ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ اخلاقی تعلیم کے علاوہ یہ بدلتے ہوئے سماج میں نوجوانوں کو اپنی دنیا آپ بنانے کا حوصلہ بخشتا ہے۔ دوسرے یہ کہ زبان کے اعتبار سے یہ ناول ان الفاظ، محاورات اور اظہارات کا ذخیرہ ہے جو متوسط طبقے کی گھریلو مجلسی اور کاروباری زندگی میں فروغ پا رہے تھے اور جو نئی سماجی ضرورتوں کے تحت زبان کو ایک نئی صورت دے رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ 'شریف زادہ' کی زبان نذیر احمد اور سرشار کے ناولوں کی زبان کے مقابلہ میں جدید بلکہ عصری معلوم ہوتی ہے۔

ضرورت تھی کہ اس اعلیٰ کلاسیکی ناول کو صحتِ متن اور خوبصورتی کے ساتھ شائع کیا جائے۔ راقم الحروف کو اسکا اولین اڈیشن تو دستیاب نہیں ہو سکا لیکن دو قدیم نسخوں سے موازنہ کر کے امکانی صحت کے ساتھ یہ متن پیش کیا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ اہلِ نظر اس اڈیشن کو پسند کریں گے۔

(ڈاکٹر) قمر رئیس شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی۔ ۳۰ جنوری ۱۹۷۰ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علیٰ سیدنا
محمد وآلہ الطیبین واصحابہ الراشدین ؁

دیباچہ

اگرچہ میری تالیفات میں شریف زادہ یعنی مرزا عابد حسین کی سوانح عمری کا تیسرا نمبر ہے لیکن میرے خیالات کے سلسلہ میں یہ پہلا ناول ہے جو میں نے بطور سوانح عمری کے تحریر کیا ہے۔ اگرچہ حجم اس کا تقریباً اسی قدر ہے جتنا کہ میرے پہلے دو ناولوں کا ہے لیکن پھر بھی بہ نظرِ طول بہت سے امر فرو گذاشت ہو گئے۔ خصوصاً مکتوبات میں سے صرف چند خطوط لے لیے گئے ہیں۔ ممکن ہے کہ آئندہ مکاتیب باقی ماندہ علیحدہ یا دوسرے ایڈیشن کے ساتھ شائع کیے جائیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شریف زادے کی لائف کا آئیڈل بعینہٖ وہی نہ ہو جو کہ مرزا عابد حسین کا ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ضرورتِ زمانہ کو دیکھتے ہوئے مرزا عابد حسین کی لائف آئیڈل ہے۔ جو مصائب مرزا عابد حسین کو اپنی زندگی میں پیش آئے وہ عجیب و غریب نہیں ہیں لیکن جن تدابیر سے انھوں نے

ان بلاؤں کا مقابلہ کر کے ان کو دفع کیا، ان کو عمل میں لانے کی جرأت ابھی ملک میں بہت کم پیدا ہوئی ہے، حرفت کو عار سمجھنا ابھی بڑے بڑے شہروں خصوصًا لکھنؤ میں عام ہے اور یہ امر ہماری ترقی میں حارج ہے۔ عورتوں کے جہل اور بداخلاقیوں سے جو کچھ نقصان سوسائٹی کو پہنچ رہا ہے وہ بھی ظاہر ہے اور سبب ان سب مانعات کا یہ امر ہے کہ ابھی تک اعلیٰ درجے کے خیالات ملک میں شائع نہیں ہوئے۔ مفید محنت کو عبادت سمجھ کر اس سے لذت اٹھانے کا خیال ابھی پیدا ہی نہیں ہوا ہے۔ ضرورت کی قہرمانی کا تسلط اور اس کے دفاع کی فکر اہلِ ملک کے دلوں میں جاگزیں ہو چکی ہے لیکن اس دفاع کو جہادِ نفس سمجھنے کی توفیق سے ابھی بہت لوگ محرومِ ہیں۔ فکرِ معیشت سے فارغ ہو کر اپنی ذات کو خلق اللہ کی بھلائی کے لیے وقف کر دینا۔ یہ مرحلہ ابھی ہماری ہمتوں سے بہت ہی بعید ہے۔ دولت کے زیادہ کرنے کی فکر میں ایک زمانہ مبتلا ہے۔ لیکن دولت کے اصل مصرف سے ابھی معدودے چند واقف ہیں۔ قناعت اور توکل کے مفہوموں میں طرح طرح کی غلط فہمیاں واقع ہو گئی ہیں۔ ایثار ایک پرانا خیال سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ مذہب کی بنیادِ رفیع اسی پر قائم ہے۔ اسی طرح فرض کے معنی سمجھنا اور اس سے ذاتی اُنس پیدا کرنا اس کا شوق ابھی دلوں میں پیدا نہیں ہوا ہے۔ ابھی تک دفع الوقت کا ماحصل زندگی خیال کرتے ہیں اور خوشی کی دیوی کے پجاری ہیں۔ سعادت کے چہرۂ زیبا سے نقاب اٹھانے کا ولولہ کیسا وہم بھی نہیں ہے۔ ہماری زندگی حشرات الارض کی زندگی ہے۔ انسانیت اور اس کے امتیاز سے ہم بالکل بے خبر ہیں۔ شرافتِ نفس کی وقعت ہماری نگاہوں میں گریک میتھالوجی کے کسی ادنیٰ درجے

کی (دیوی) کا ڈیلیس سے زیادہ نہیں ہے۔ دور اندیش گورنمنٹ کی عنایتوں نے معیشت حاصل کرنے کے لیے جو حدودِ علمی قائم کیے ہیں، بہ مجبوری اس کو ہم طے کر لیتے ہیں۔ لیکن ہمارے دلوں میں ابھی وہ مدات فضول ہیں۔ اکثر علوم جو کالجوں میں پڑھائے جاتے ہیں۔ ان کو طوعاً وکرہاً ہم پڑھ لیتے ہیں۔ کیونکہ بغیر اس کے کسبِ معیشت ہو نہیں سکتا مگر عام خیال یہ ہے کہ ان علوم کو ہماری لائف سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ گویا ہماری رائے یہ ہے کہ "حکیم افلاطون" نے اپنے دار العلوم پر جو یہ مقولہ "من لایعلم جیو مطریا لایدخل دارنا" (جو جامیٹری نہیں جانتا ہمارے گھر میں داخل نہ ہو) لکھا ہوا تھا۔ یا یونان کے ہیکل الشمس پر یہ مقولہ "خود را بشناس" کندہ تھا۔ یہ سب پرانے دقیانوسی خیالات ہیں اور تقلیداً ان کی پیروی ایک حد تک غیر معقول کی جاتی ہے۔ ہماری اصل لائف کو جامیٹری یا سیکالوجی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ ہاں منطق کسی قدر بے جا بحثیں کرنے کے لیے بکار آمد ہو سکتی ہیں۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اگر معیارِ علم و فضل ہماری رایوں پر چھوڑ دیا جائے تو ہم اس کو بہت ہی سہل الاصول کر دیں۔ ہم کو صرف انگلش لینگویج (انگریزی زبان) جاننے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے لندن کے جادو نگار رینالڈس کے ناولوں کا مطالعہ کافی ہے۔ اور اردو زبان میں اس کے ترجموں کی ضرورت ہے۔ ہاں اگر ہمارا انشاء ہو کہ ہم علوم حاصل کریں اور بالفعل ملک میں متواتر قحط سالیوں کے ہونے کی وجہ سے اس کی چنداں ضرورت نہیں رہی بلکہ کسبِ معیشت کی فکر چاہیے۔ پھر یہ کہ زندگی چند روزہ ہے۔ اس میں اس قدر علم و فضل حاصل کرنا فضول ہے۔ غرض کہ اسی قسم کی پست ہمتی ملک میں پھیلی ہوئی ہے۔ ایک تجربہ کار پروفیسر نے

کو بارہ برس سے زیادہ ایک کالج میں تعلیم دیتے ہوئے گزر گئے اس کی یہ شہادت قابلِ عبرت ہے جسے ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

"مجھ کو بارہ برس سے زیادہ مدت ایک کالج میں تعلیم دیتے گزر گئی۔ میں نے اس عرصۂ دراز میں ایک طالب علم کو بھی نہیں دیکھا"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے کالجوں میں اکثر ایسے لوگ ہی تعلیم پاتے ہیں جن کو ذاتی شوق تحصیل علوم کا نہیں ہے۔

مرزا عابد حسین کی لائف کے پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ اگرچہ ان کو اعلیٰ درجے کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن وہ سچے طالب علم ہیں اور طلبِ علم اور حصولِ علم سے جو برکت ایک شریف النفس انسان کو حاصل ہو سکتی ہے وہ ان کو حاصل ہوئی۔ اگرچہ ابتدائے حال میں ضرورت نے ان کو ایسے کام میں لگا دیا تھا کہ جس سے دفع الوقتی ہو سکتی ہے لیکن ان کے جوہرِ ذات میں ذاتی شوق تحصیلِ علم کا موجود تھا۔ اس امر کا فیصلہ کرنا بہت دشوار ہے کہ ان کی سیرت (کیریکٹر) کو کن اسباب نے ایسا عمدہ بنا دیا۔ ممکن ہے کہ کوئی عنصر خلقی ان میں وہبی رہا ہو لیکن وہ خود تساوی استعدادات کے قائل ہیں۔ یعنی ان کا خیال ہے کہ ہر انسان مجھ سا ہو سکتا ہے۔ اگر وہ ارادہ کرے۔ ارادے کے لیے محرک (موٹیو) ہونا چاہیے۔ اس کا جواب مرزا عابد حسین صاحب شاید دیں گے کہ مقصود کی خوبی کا تصور محرک قوی ہے۔ یعنی اگر انسان کو اس کا موقع ملے کہ وہ فطرت اور اپنی ذات کے تعلقات پر غوص کرے اور قبل اس غوص کے توحید کا قائل ہو چکا ہو اور اس کا ایمان درست ہو اور صحبتِ بد کا اثر اس پر نہ پڑ چکا ہو تو ممکن نہیں کہ وہ منشائے

ابداع کو نہ سمجھے اور اس کا نتیجہ تہذیبِ اخلاق نہ نکالے اور من بعد سعادت کا تصور اس کے دل میں نہ پیدا ہو۔ جس کو لسان شرع میں نورِ الٰہی کہتے ہیں۔ ان مرحلوں کو طے کرنے کے بعد ارادہ کی قوت سے اخلاق خود بخود درست ہونے لگیں گے۔ اور صحبتِ بد کی شرط نہایت اہم ہے اس لیے کہ جب تک دوسری طبیعتوں کا اثر اس پر نہیں پڑتا وہ خالی الذہن ہوتا ہے۔ اگر اس حالت میں صحبتِ نیک اس کو میسر ہو یا اگر ایسا نہ ہو تو وہ اخلاق کی کتابیں دیکھے اور حکمائے الٰہی یا بزرگانِ دین کے اقوال اور سیرت سے اُنس پیدا کرے اور ابتدائے سلوک میں تقلید اپنا مسلک قرار دے کر منزلِ تحقیق کا جویاں ہو تو ضرور ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگا اور اس کامیابی کے بعد خلق اللہ کے مقصد کو اپنا عین مقصود اور اپنی زندگی کا ماحصل تصور کرے تو اس حالت میں اس کی سیرت تشبہ اخلاق الٰہی کی صفت سے موصوف ہوگی۔ ابتدائے سلوک میں سالک کو ریاضتِ ذہن اور اس وسیلہ سے تحصیلِ علم و معرفت کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ اور اس طرح رفتہ رفتہ خیر کثیر کے فیضان سے مستفیض ہوتا ہے۔ پھر اس کو لافانیتِ نفس کا وثوق ہو جاتا ہے اور ایک خاص قسم کا ذوق اس کی طبیعت میں خود بخود پیدا ہو جاتا ہے اور بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ اِس ذوق کو لِم دان سے خود نہیں واقف ہوتا۔ ایک قدرت اس کو کسی طرف کھینچتی ہے۔ یہ حالت جذب کی ہے۔ کبھی کبھی حالتِ وجد میں بمقتضائے بشریت بول اٹھتا ہے "مالا بناء الملوک من ہذہ اللذّات" (یعنی دولت کی گودیوں کے پلے ہوئے ان لذتوں کو کیا جانیں) اس کے بعد وہ مرتبہ ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ "لاعین رأیت

ولا اذن سمعت ولا خطر ببال" نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے اور نہ کسی کان نے سنا ہے نہ کسی دل میں اس کا خیال آیا ہے۔

ہماری یہ تحریر اکثر صاحبوں کو جو اس حال سے باخبر نہیں ہیں مجذوب کی بڑ معلوم ہوگی مگر ہم ان کو صدق دل سے یقین دلاتے ہیں کہ مرزا عابد حسین کے سے اخلاق والے ان سب امور کا تجربہ کر چکے ہیں۔ ہم ایک جنٹلمین کے کہنے پر اس کو مان چکے ہیں۔ آپ چاہے مانیں چاہے نہ مانیں۔

اکثر ایک کتاب کے مطالعہ سے ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان اپنی لائف کا طریقہ خاص اختیار کرے۔ مرزا عابد حسین صاحب نے اکثر فرمایا ہے کہ مجھ کو اپنی زندگی کا منصوبہ بنانے کے لیے ایک انگریزی کتاب سے بہت مدد ملی جس کا نام "پرسوٹ آف نالج انڈر ڈفیکلٹیز" تحصیلِ علم در مصائب تھا اگر ایسی کتابوں سے فائدہ پہنچ سکتا ہے تو ہم کو امید قوی ہے کہ مرزا عابد حسین کی لائف ضرور نافع ہوگی۔ انشاء اللہ۔

مرزا رسوا

شریف زادہ

ہمارے عنایت فرما مرزا عابد حسین صاحب کے والد ماجد مرزا باقر حسین مرحوم حضرت عباسؑ کی درگاہ کے پاس کہیں رہتے تھے۔ پختہ مکان تھا۔ دس روپیہ ماہوار بلا شرطِ خدمت نواب مکرم الدولہ بہادر کی سرکار سے پاتے تھے۔ اس میں خدا نے یہ برکت دی تھی کہ بافراغت بسر کرتے تھے۔ تین سو روپے کا بی بی کے ہاتھ گلے میں گہنا تھا۔ سو پچاس کا گھر میں اثاثہ تھا۔ دس بیس روپے وقت بے وقت صندوقچے سے نکل بھی آتے تھے۔ عابد حسین کی والدہ نے کبھی آپ چولھا نہیں پھونکا، ماما ہمیشہ نوکر رہی۔ عابد حسین کی کوئی تقریب ایسی نہیں ہوئی جس میں دس بیس عزیز جمع نہ ہوئے ہوں۔ ڈومنیاں نہ آئی ہوں۔ عابد حسین کی شادی اپنے مقدار اور حوصلے کے موافق اچھی طرح کی۔ اگرچہ اس تقریب میں مرزا صاحب مرحوم کسی قدر مقروض ہو گئے تھے مگر جہیز بیچنے کی نوبت نہیں آئی۔ شادی کے برسویں دن ایک لڑکا پیدا ہوا اور اس کی چھٹی بھی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ جب تک ماں باپ زندہ رہے مرزا عابد حسین کو کھانے پینے کی طرف سے فراغت تھی۔ محلہ میں ایک مولوی صاحب رہتے تھے ان سے فارسی پڑھتے تھے۔ اسکول میں انگریزی پڑھنے جاتے تھے۔

جب مرزا باقر حسین نے انتقال کیا۔ عابد حسین مڈل کلاس تک پہنچ گئے تھے۔ اگرچہ والد کے مرنے کا صدمہ بہت سخت ہوا مگر جوں توں کر کے مڈل پاس ہو گئے۔

والد کے مرنے کے بعد گھر کے انتظام کا کل بار ان کے سر پر پڑا۔ مگر اخراجات سے کسی قدر اطمینان تھا اس لیے کہ نواب کی سرکار سے سات روپیہ ماہوار ان کی والدہ کو ملتا رہا مگر ان کی بدقسمتی سے پورا سال نہ گزرنے پایا تھا کہ نواب کربلائے معلیٰ چلے گئے اور وہاں جا کے دو ہی مہینے کے بعد انتقال فرمایا۔

اب یہ انٹرنس کلاس میں تھے جب باہر کی آمدنی بالکل موقوف ہو گئی تو اخراجاتِ روز مرہ کے لیے گھر کا اثاثہ بکنے لگا۔ یہاں تک کہ سونے چاندی کا اسباب بک گیا۔ تانبے کے برتنوں کی نوبت آئی وہ بھی ایک ایک کر کے بک گئے۔ یہاں تک کہ سوائے دو تین پتیلیوں اور دو لوٹوں کے کچھ باقی نہ رہا۔

یہ اب تک اسکول میں پڑھنے جاتے تھے اور تمام امیدیں امتحان کے پاس ہونے پر منحصر تھیں۔ یہاں تک کہ امتحان کا زمانہ قریب آیا۔ ہیڈ ماسٹر نے فیس طلب کی۔ بیوی کی چوڑیاں گروی رکھ کے دس روپے فیس کے جمع کیے۔ امتحان کے دو دن باقی تھے کہ والدہ ہیضے میں مبتلا ہوئیں اور ٹھیک اسی دن انتقال کیا کہ جس دن انھیں امتحان میں شریک ہونا چاہیے تھا۔ اس حادثۂ ناگہانی کی وجہ سے بیچارے امتحان سے محروم رہے۔ ساری محنت کی کرائی خاک میں مل گئی۔

ماں کا مرنا تھا گویا ان کے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ خانہ داری کا پورا

پورا بوجھ دفعتہً آن پڑا۔ گھر کا اسباب اور بیوی کا جہیز ماں کے جیتے جی یک قلم صرف ہو چکا تھا اور جو کچھ رہا سہا تھا وہ اُن کی تجہیز و تکفین اور رسوم فاتحہ وغیرہ میں صرف ہو گیا۔ اب گھر میں ایک حبہ نہیں ہے جسے گروی رکھیں یا بیچ لیں۔ گھر میں ایک خود ہیں، ایک بی بی، ایک لڑکا کوئی تین برس کا، ایک لڑکی چھ مہینے کی گود میں، ابھی تک صورتِ روزگار نہیں اور نہ کہیں سے امید ہے مگر استقلال یہ ہے کہ ابھی تک پڑھے جاتے ہیں۔ امتحان کے چھ مہینے اور باقی ہیں کسی طرح ہو اب کی ضرور پاس ہونا چاہیے۔ آخر کچھ نہ بن پڑا۔ ایک فتو کنجڑا رہتا تھا۔ مکان اس کے پاس سو روپے پر گروی رکھا رہن با قبضہ تھا۔ خود محمود نگر کے تلے پر ایک کچا سا مکان ایک روپیہ ماہوار کرایہ پر لے کر رہنے لگے۔ خیر امتحان کے زمانے تک کے لیے اطمینان ہو گیا۔ جی توڑ کے محنت کی۔ خدا خدا کر کے پاس بھی ہو گئے۔ اب نوکری کی تلاش ہے۔

آج بہت ہی پریشان گھر سے نکلے ہیں۔ منہ اترا ہوا ہے۔ آنکھوں میں حلقے پڑ گئے ہیں۔ مارے ضعف کے قدم نہیں اٹھتا۔ (دل میں کہے جاتے ہیں)

افسوس! آج ہمارے بیوی بچوں کا دوسرا فاقہ ہے۔ راستے میں جو لوگ ملتے ہیں، ان کے چہرے کس قدر بشاش نظر آتے ہیں۔ کنجڑوں کی دکانیں میووں اور ترکاریوں سے بھری ہوئی ہیں۔ نان بائی گرم گرم شیرمالیں اور خمیری روٹیاں تنور سے نکال رہے ہیں۔ نہاری کے پتیلے سے گرم گرم بھاپ نکل رہی ہے۔ فجو کی دوکان پر حلوہ سوہن بھی تازہ تازہ بنا ہوا ہے۔ تمام راستہ مہکا ہوا ہے۔ حلوائیوں کی دکانوں پر پوریاں، کچوریاں، حلوے، مٹھائیاں کیسی پٹی پڑی ہوئی ہیں۔ اس میں سے کچھ بھی ہمارا اور ہمارے غریب بیوی بچوں

کا حصہ نہیں۔ صراف کی دوکانوں پر پیسوں کا ڈھیر ہے۔ لوگ کیسے چھنا چھن روپے بھناتے ہیں۔ ہم کو ایک پیسہ تک نہیں میسر کہ اپنے بچوں کے لیے چنے بھنا کے لے جائیں۔

انٹرنس کا سارٹیفکٹ جیب میں ہے۔ اگر تھوڑا سا شیرہ ممکن ہوتا تو بلا سے اسی کو چاٹتے یا بیوی بچوں کو چٹاتے۔ افسوس میں نے بڑی غلطی کی۔ جیسے ہی مڈل پاس ہوا تھا رڑکی کالج میں چلا جاتا۔ دو سال کسی نہ کسی طرح گذر ہی جاتے۔ دیکھو رام چرن میرے ہی ساتھ مڈل میں پاس ہوا تھا۔ اب سنا ہے کہ رائے بریلی میں اسے سب اُوورسیری مل گئی ہے۔ کاش مڈیکل کالج ہی چلا جاتا۔ ہیڈ ماسٹر نے اس زمانے میں کیسا کیسا کہا۔ افسوس میں نے اپنے ہاتھ سے اپنے پاؤں میں کلہاڑی ماری۔ تین برس مفت ضائع ہوئے۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ ان ہی خیالات میں غلطاں پیچاں لڑکھڑاتے ٹھوکریں کھاتے گول دروازے تک پہنچ گئے۔ اب قریب دس بجے کا وقت تھا۔ جو لوگ دفتروں میں نوکر تھے۔ اِکّوں پر سوار ہو ہو کے دفتر جا رہے تھے۔ دو ایک اِکّے والوں نے انھیں بھی ٹوکا۔

"منشی صاحب ادھر آئیے۔ حضرت گنج چلیے گا؟" یہ بیچارے حضرت گنج ہی کی طرف جانے والے تھے مگر پیسہ کہاں تھا جو سوار ہو کے جاتے۔ چپکے ہو رہے۔ سڑک کے کنارے پاپیادہ روانہ ہوئے۔

میاں تو نوکری کی تلاش میں گئے۔ اب بیوی کا حال سنیے۔ یہ بیچاری صبح سے اٹھ کے ٹوپی کاڑھنے میں مصروف تھیں۔ ایک پلہ تو کئی دن سے تیار تھا؛ دوسرے میں کچھ کام باقی تھا۔ بارے اس وقت دونوں پلے تیار ہو۔ ۔ اب اس کے فروخت کرنے کی فکر ہوئی۔ مکان میں ایک لڑکی تھی

وہاں جا کے پکاریں۔ "ہمسائی!" ہمسائی کھڑکی کے پاس آئیں۔

عابد حسین کی بیوی۔ ہمسائی تمہارے میاں گھر میں ہیں؟

ہمسائی۔ ہاں۔ کیا ٹوپی تیار ہو گئی؟

عابد حسین کی بیوی - ہاں بہن۔ خدا خدا کر کے آج تیار ہوئی۔ ذرا اپنے میاں کو دکھا دو۔ ہمسائی ٹوپی میاں کے پاس لے گئیں۔

میاں - ہاں۔ یہ ٹوپی خوب تیار ہوئی۔

ہمسائی - بھلا کتنے کی ہوگی؟

میاں - بازار میں دکھانے سے حال معلوم ہوگا۔ میرے اندازے میں تو کوئی دس گیارہ آنے کی ہوگی۔

بیوی - اچھا تو بیچ لا دو۔ بیچاری کے یہاں آج تیسرا فاقہ ہے۔ بچے غش کی حالت میں پڑے ہیں۔

میاں - تیسرا فاقہ! تم نے مجھ سے نہ کہا بنیے کے یہاں سے کچھ لا دیتا۔

بیوی - چپ رہو۔ کھڑکی کے پاس کھڑی ہیں۔ کہیں سن نہ لیں۔ بڑے غیرت دار لوگ ہیں۔ چاہے دم نکل جائے منہ سے نہ کہیں گے۔ قرض دام بھی نہیں لیتے۔ بیوی میاں دونوں کی ایک راہ ہے۔ جب فاقہ ہوتا ہے بچوں تک کو گھر سے نکلنے نہیں دیتے۔

میاں - بڑے عالی خاندان ہیں۔ خدا نے اب مصیبت ڈالی ہے۔ ان کے باپ کے کارخانے ہی اور تھے۔ اچھا تو لاؤ میں جلدی سے ٹوپی بیچ لاؤں۔

یہ کہہ کے میاں حسین علی نے الگنی پر سے انگرکھا اتار کے پہنا۔ ٹوپی پہنی۔ وہ ٹوپی جیب میں رکھی۔ گھر سے نکلے۔ جلدی جلدی پارچے والی گلی پہنچے۔ دو ایک دوکان داروں کو وہ دونوں پلے دکھائے۔ کسی نے گیارہ آنے لگائے۔

کسی نے بارہ آنے لگائے۔ ایک صاحب شوقین ایک دکان پر ٹوپیاں دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے یونہی سرسری نگاہ سے دونوں پلے دیکھ کے آنکھ سے اشارہ کیا۔ یہ دوکاندار سے ٹوپی لے کے تھوڑی دور آگے جاکے کھڑے ہو رہے۔ تھوڑی دیر میں وہ آگئے۔

خریدار۔ اچھا تو کتنے کو دیجیے گا؟

حسین علی ۔ حضرت میرا تو مال نہیں ہے۔ جس کا مال ہے اس نے کہہ دیا ہے کہ ایک روپے سے کم نہ دینا۔ اب آپ کو اختیار ہے لیجیے یا نہ لیجیے۔

خریدار ۔ دوکاندار بارہ آنے لگاتا ہے، آپ ایک روپیہ مانگتے ہیں۔ اتنا فرق!

حسین علی ۔ دکاندار تو چاہتے ہیں کہ کلی ڈال کے لوٹ لیں۔ جب بیچنے والا بھی دے۔

خریدار۔ اچھا چودہ آنے لے لو۔

حسین علی۔ روپئے سے ہرگز کم نہ ہوگی۔

خریدار۔ (پھر ایک مرتبہ ٹوپی کے دونوں پلوں کو اُلٹ پلٹ کے دیکھا) اچھا۔ خیر ایک ہی روپیہ لے لو۔ تمہاری ہی ضد سہی۔

حسین علی ۔ درست ہے۔ اے حضور مال نہیں ہے؟

خریدار۔ اس میں شک نہیں، بنی اچھی ہے اور اس کے ساتھ کی مل سکتی ہے؟

حسین علی ۔ جی اور کہاں۔ میرے پاس ایک ہی کاریگر ہے۔ اس کام کی دس بارہ دن میں ایک ٹوپی تیار ہوتی ہے۔

خریدار ۔ اچھا تو اب کی ٹوپی جو بنے تو ہم ہی کو دینا۔ تمہارا مکان کہاں ہے؟

حسین علی ۔ آپ اپنا دولت خانہ بتا دیجیے جس دن ٹوپی تیار ہو جائے گی لے کر حاضر ہو جاؤں گا۔

خریدار۔ یہ کیا جھوائی ٹولہ میں حکیم صاحب کے مکان کے قریب نواب محمد عباس

صاحب کمرے میں بیٹھے رہتے ہیں، ان ہی سے پوچھ لینا، میر صاحب کہاں رہتے ہیں بلکہ میں وہیں ملوں گا۔ اے لو یہ روپیہ تو لو۔ باتوں میں دینا ہی بھول گیا۔

حسین علی۔ کیا ہرج ہے پھر مل جاتا۔

خریدار تو روپیہ دے کر اُدھر روانہ ہوا۔ ادھر میاں حسین علی خوش خوش قدم بڑھاتے ہوئے گھر کی طرف چلے۔

آہا! کیا ایسے لوگ ابھی زندہ ہیں جو دوسروں کا کام کر کے خوش ہوتے ہیں؟ ہاں ہیں۔ اور ایسے لوگوں میں ہیں جن کو مغرور بندۂ زر حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، جن کا چال چلن بہت ہی سیدھا سادہ ہے۔ اس لیے لوگ انہیں بے وقوف سمجھتے ہیں۔ انھوں نے وہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم نہیں پائی جو خود غرضی کے اصول سکھاتی ہے۔ اسی لیے انھیں سادہ لوح کا خطاب دیا جاتا ہے۔ انھوں نے وہ علمِ مجلس نہیں حاصل کیا جس میں ظاہر داری اور بناوٹ انسانیت کے اصلی جذبات کو چھپا دیتی ہے۔ اس لیے بیچارے بے تمیز خیال کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے وہ لغو فلسفہ نہیں پڑھا جو مذہب کے مقدس اصول میں شک ڈال دیتا ہے۔ اس لیے جاہل کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ یہ لوگ گورنمنٹ کی مصلحتوں کو نہیں سمجھتے نہ اس میں نکتہ چینی کرتے ہیں اس لیے انھیں اعلیٰ درجہ کی یا تمدنی عزت کے حاصل کرنے کا خیال ہی نہیں۔ قومی اصلاح کی انھیں فکر نہیں رہتی۔ اس لیے کہ اصل محرک یعنی شہرت کی ہوس انھیں ہوتی ہی نہیں۔

جب حسین علی روپیے لے کے آئے تو انھوں نے اپنی بیوی کو دیا۔ بیوی خوشی خوشی دوڑی گئیں۔ مرزا عابد حسین کی بیوی کو کھڑکی کے پاس بلایا۔ روپیہ حوالہ کیا۔ اس وقت کی خوشی اس نیک بخت اور غریب بی بی کی زبانِ قلم سے

ادا نہیں ہو سکتی۔ اس روپیہ کی قدر اسی کو ہو سکتی ہے جس کے بچوں نے دو دن سے کچھ نہ کھایا ہو۔ جس کا شوہر روز صبح کو بھوکا پیاسہ نوکری کی تلاش میں نکل جاتا ہو اور شام کو مایوس گھر میں آکر چپکا سو رہے۔ بیوی نے فوراً میاں حسین علی سے روپیہ بھنایا۔ بنیے کی دوکان سے کھانے کے لیے اناج منگایا۔ بچوں کو جلدی سے دو ٹکیاں ڈال کے کھلائیں۔ پانی پلا کے سلا رکھا۔ خود کچھ نہیں کھایا۔ ایک ٹوپی کا کپڑا اور رکھا تھا۔ اسے بقچی سے نکالا۔ چھاپے نکالے۔ گیرو کی سیاہی میں تھوڑا سا پانی ڈال کے ٹوپی چھاپی۔ کاڑھنا شروع کر دی۔ مارے بھوک کے آنکھ سے ٹانکا نہیں سوجھتا۔ بھوک سے گال مرجھائے جاتے ہیں۔ ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ مگر کیا ممکن کہ بے میاں کے کچھ کھالیں۔ دل قوی ہے۔ چار دن کے کھانے کو سامان گھر میں موجود ہے۔ شام کو میاں آئیں گے۔ خدا کرے آج کہیں نوکری ہو جائے۔ کیا ہی اچھی بات ہے۔ اسی خیال کے ساتھ ہی ایک آہِ سرد دل سے نکلی اور اس کے ساتھ دو دو آنسو ڈھلک کے گالوں تک آگئے۔ ہاتھ رک گیا۔ ڈوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھے۔ پھر چھپا چھپ سوئیاں نکلنے لگیں۔

اب چار بجے ہوں گے۔ کھانا پکانے کا وقت ہے۔ انھیں یہ خیال ہے کہ یہ پھول اور تمام کر لوں تو اٹھوں۔ پھول بن گیا۔ ٹوپی کو ہاتھ میں لے کے پلنے کو دونوں ہاتھوں سے پھیلا کے شکن مٹائی۔ جو پھول بن گئے تھے ان کو غور سے دیکھا۔ پھر سوئی لگا کے ٹوپی بقچی میں باندھ دی۔ اٹھیں۔ وضو کیا۔ ظہرین کی نماز پڑھی۔ پھر کوٹھری سے تول تول کے آٹا دال نکال لائیں۔ نمک مصالحہ علیحدہ علیحدہ کر کے رکھا۔ چولھے میں آگ سلگائی۔ دال دھو کے چڑھائی۔ آٹا گوندھنے بیٹھ گئیں۔ ادھر عابد حسین سرِ شام گھر کی طرف پلٹ رہے ہیں۔ دن

پھر میں کئی دفتر چھان مارے۔ دس بارہ بنگلوں پر گئے مگر جہاں گئے ادھرعرضی دی، یہی صدا سنائی دی۔ کوئی جگہ خالی نہیں ہے۔ ایک صاحب نے یہ رائے دی۔ صدر بازار جاؤ۔ شاید گوروں کو اردو پڑھانے کے لیے نوکر ہو جاؤ۔ صدر گئے۔ بارکوں میں مارے مارے پھرے۔ دو ایک گوروں نے بلایا بھی۔ مگر نہ اُن کی یہ سمجھے نہ وہ ان کی سمجھے۔ بات یہ ہے کہ انھوں نے انگریزی اول تو پڑھی ہی کیا تھی۔ دوسرے جو کچھ پڑھی تھی وہ ہندوستانی ماسٹروں سے پڑھی تھی۔ انٹرنس کلاس میں جو صاحب انگریزی پڑھاتے تھے اُن کا تلفظ بہت صاف تھا۔ وہ بھی مشکل سے سمجھتے تھے۔ گوروں کا لہجہ بھلا ان کی سمجھ میں کیا آتا۔ خلاصہ یہ کہ جہاں گئے وہاں سے ڈیم فول بنا کے نکالے گئے۔ اس آوارہ گردی میں شام ہو گئی۔ اب ضعف کے مارے چلا نہیں جاتا۔ ہر قدم پر چکر آتے ہیں۔ مگر مجبوری گھر تو کسی نہ کسی طرح پہنچنا ہی ہے۔ گھر میں بیوی بچوں کو جس حالت میں چھوڑ آئے تھے اس کی تصویر تو دن بھر پیشِ نظر رہی مگر امید بڑی چیز ہوتی ہے۔ جس نے دن بھر بہلائے رکھا۔ خوب دوڑایا۔ جب اچھی طرح تھکا چکی تو چھوڑ دیا۔ اب اسی پرانے رفیق سے کام پڑا جسے یاس کہتے ہیں۔ اس سے اور کچھ نہ ہو سکا۔ موت کے تصور کو سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔ آخر ہونا ہی کیا ہے؟ اگر یہی حال ہے تو مر بھی جائیں گے۔ ہائے اپنا مر جانا تو کچھ ایسا دشوار نہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کا ایڑیاں رگڑ رگڑ کے جان دینا کس سے دیکھا جائے گا۔ اُف! مفلسی کیا بری بلا ہے۔ اس سے اب نجات ہو ممکن نہیں۔ کاش بیوی بچے نہ ہوتے۔ میرے ساتھ ان کمبختوں کی بھی مٹی خراب ہوئی۔ کچھ بن نہیں پڑتا۔ کروں تو کیا کروں۔ اسی خیال میں تھے کہ ایک چکر آیا۔ اس نے سڑک کے کنارے ایک جگہ گھاس پر بٹھا دیا۔ اب اٹھتے

میں تو اٹھا نہیں جاتا۔ ساتھ ہی یہ خیال آیا۔ گھر جا کے کیا کریں گے۔ یہاں سے سیدھے موتی محل کے پل کی منڈیر سے اپنے کو دریا میں گرا دو۔ ڈوب مرو۔ :: میدی کی رائے پسند آئی تھی کہ اس کے ساتھ ہی بیوی بچوں کی بے کسی کا خیال آیا۔ بے اختیار آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ خیر کچھ نہ سہی۔ میرے دم سے بیچاروں کو کسی قدر سہارا تو ہے۔ کسی کی آس توڑنا اچھا نہیں ہے۔ یہ کیا بودا پن ہے۔ اب عالی خاندانی اور بے جا شرم کو ترک کرنا چاہیے۔ نوکری اس زمانے میں ملے۔ ممکن نہیں۔ کل سے ٹوکری لے کے چوک میں جانا چاہیے۔ کیا کہیں مزدوری بھی نہیں ملے گی۔ محنت مزدوری میں کوئی عیب نہیں۔ شام تک دو آنے تو ملیں گے۔ بچے فاقے سے تو نہ پڑے رہیں گے۔ اچھا اگر یہ بھی نہ ہو سکے مکان جو گردی ہے اسے بیچ ڈالنا چاہیے۔ دس بیس جو بڑھیں اس سے نخاس میں کاٹ کباڑ کی دکان کھولیں۔ شاید اسی سے کام چلے۔

یہ ان ہی خیالات میں تھے۔ اتنے میں ایک گنوار سا آدمی سر میں پھینٹا بندھا ہوا مرزئی پہنے، دھوتی باندھے ان ہی کے قریب آ کے بیٹھ گیا۔ یہ اٹھنے ہی کو تھے کہ اس شخص نے پوچھا "میاں صاحب آپ کچھ پھارسی (فارسی) پڑھے ہیں؟"

عابد حسین۔ ہاں پڑھا تو ہوں۔ کیوں؟

وہ شخص۔ مجھے ایک خط پڑھوانا ہے۔

عابد حسین۔ پڑھ تو دیتا مگر یہاں روشنی کہاں ہے؟

وہ شخص۔ سامنے لالٹین کے پاس چل کے پڑھ دیجیے۔

عابد۔ چلو۔ یہ کہہ کے لالٹین کے پاس آئے۔ اس نے مرزئی کی جیب سے

خط نکال کے دیا۔ خط کاہے کو ایک طومار کا طومار تھا۔

خط کا خلاصہ یہ تھا کہ بلدیو مستری کی معرفت ایک ہزار روپئے کا لوہا خرید کر بھیج دو۔ مبلغ دو سو روپے نقد اس خط کے ساتھ روانہ کیا جاتا ہے۔ وہ دے دینا۔ باقی روپیہ بروقت پہونچنے لوہے کے بھیج دیا جائے گا اس کے بعد لوہے کی فہرست تھی جسے اٹک اٹک کر پڑھتے جاتے تھے اور وہ بتاتا جاتا تھا۔ خدا خدا کرکے وہ خط تمام ہوا۔ اب وہ شخص کہنے لگا۔ اچھا تو اب اس کا جواب میں کس سے لکھواؤں گا۔ آپ ہی لکھ دیجیے۔ بڑا ضروری خط ہے۔ منت سماجت کرنے لگا۔

وہ شخص ۔ تھوڑی دور چلے چلیے۔ بلدیو مستری کا کارخانہ ہے۔

عابد ۔ میرا مکان یہاں سے بہت دور ہے۔ مجھے بہت رات ہو جائے گی۔ تم کسی اور سے لکھوا لینا۔

وہ شخص ۔ دیر نہیں ہونے پائے گی اور اگر دیر ہو جائے گی تو گھر کا اکہ ہے۔ میں آپ کو سواری پر بھجوا دوں گا۔

عابد ۔ (دل میں) ہرج ہی کیا ہے۔ چلو اچھا ہوا۔ چلا بھی نہیں جاتا ہے۔ اِکہ پر سوار ہو کر جلدی سے گھر پہنچ جائیں گے۔

اچھا تو چلو۔

اس شخص کے ساتھ بلدیو مستری کے کارخانے میں پہنچے۔ دیکھا ایک بڑا سا احاطہ ہے۔ اس میں چاروں طرف کھپریلیں پڑی ہیں۔ صحن میں جدھر دیکھو لوہے کا ڈھیر ہے۔ ایک طرف پتھر کے کوئلوں کا انبار لگا ہے۔ کھپریلوں میں جا بجا لوہے کی بھٹیاں بنی ہوئی ہیں۔ دھونکنی چل رہی ہے۔ لوہا سرخ کر کرکے ان سے نکالا جاتا ہے۔ ہتھوڑے چل رہے ہیں۔

ایک کھپریل میں ایک چارپائی بچھی ہے۔ اس کے پاس دو تین چیڑ کے صندوق پڑے ہیں۔ ان میں سے ایک پر ایک بوڑھا سا آدمی لیکن بہت ہی توانا عینک لگائے بیٹھا ہے۔ قرینے سے معلوم ہوا کہ بلدیو مستری یہی ہے۔ جو شخص ان کو لے گیا تھا اس نے ایک صندوق پر ان کو بٹھا دیا۔ چراغ دان لاکے ان کے آگے رکھ دیا۔ ان سے کہا کہ ذرا مستری جی کو یہ خط پھر سنا دیجیے۔ انھوں نے خط پڑھ کے سنایا۔ اب جواب لکھنے کے لیے قلم دوات کی ضرورت ہوئی۔ بلدیو نے کہا۔ بھیا سے مانگ لو۔ اس شخص نے مادھو بھیا کہہ کے پکارا۔ بھیا مادھو، بلدیو کا لڑکا۔ کوئی چودہ پندرہ برس کا سن سامنے کھپریل میں ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے چھوٹی سی میز لگی تھی۔ اس پر کتابیں رکھی تھیں۔ لیمپ روشن تھا۔ اس شخص کی آواز سن کے جواب دیا۔ کاکا کیا ہے؟

وہ شخص۔ اپنی قلم دوات تنی لے آؤ۔ تھوڑا کاگد بھی لیتے آئیو۔

بھیا مادھو قلم دوات کاغذ لے کے آئے۔ مرزا عابد حسین جواب لکھنے لگے۔ وہ بھی پاس بیٹھ گیا۔

جواب لکھنے میں بڑی دیر ہوئی۔ اس لیے کہ ہر قسم کے لوہے کا وزن اور قیمت مع نرخ کے لکھوایا جاتا تھا۔ مرزا صاحب کے حواس بجا نہ تھے۔ بھیا سے حساب کرنے میں ان کو مدد ملی۔ اس درمیان میں اِدھر اُدھر کی باتیں بھی ہوتی جاتی تھیں کیوں کہ ان لوگوں کو تو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ بیچارے کس آفت میں مبتلا ہیں۔ نہیں تو شاید جلدی کرتے۔ یہ ایک نئے آدمی شہر کے رہنے والے وہاں جا کے پھنسے تھے۔ معمولی باتیں یہ کہ آپ کا مکان کہاں ہے؟ اس طرف کیوں آئے تھے؟ ان سے پوچھنا ضرور تھیں۔ سب سے

زیادہ مادھو بھیا کو ان کے حال پر توجہ تھی کیونکہ مادھو بھیا انگریزی پڑھتے تھے اور ان کے طرز تقریر سے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ بھی انگریزی جانتے ہیں ۔ شاید اثنائے کلام میں یہ بھی پوچھا گیا تھا کہ آپ نے کہاں تک انگریزی پڑھی ہے اور آپ کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا ہو کہ میں انٹرنس پاس ہوں۔ مادھو بھیا ابھی مڈل کلاس کے دو درجے نیچے تھے۔ پھر ان کا فارسی خط بھی بہت ہی صاف تھا اور مادھو بھیا آج ہی بدخطی کے لیے کلاس میں دو نمبر اتار دیے گئے تھے۔ اس وجہ سے مادھو بھیا کے دل میں ان کی عزت کا خیال سما گیا تھا۔

انٹرنس پاس کا نام سن کے بلدیو مستری بھی چونک پڑے تھے۔ اس لیے کہ جب سے مادھو کو اسکول میں پڑھنے بھیجا تھا۔ مڈل اور انٹرنس یہ دونوں لفظیں اتنی مرتبہ سنی تھیں کہ اب ان کا بھولنا ممکن نہ تھا۔ بہت دن تک یہ مڈل اسکول کو اعلیٰ درجہ سمجھا کیے۔ لیکن جب سے ریل کے دفتر میں پرشادی بابو دس روپے مہینے پر نوکر ہوئے مڈل پاس کی عزت ان کی نگاہ میں کم ہو گئی مگر کہیں سن لیا تھا کہ بڑے بابو جو لو کو آفس میں نوکر ہیں۔ وہ انٹرنس پاس ہیں۔ ماسٹر جانکی پرشاد جو مادھو کو گھر پر انگریزی پڑھاتے تھے وہ وکیل ہو گئے۔ اب پیچھے وہ بھی کیا برے رہے۔ گنپت بڑھئی کا لڑکا چھوٹے لال انٹرنس پاس کر کے رڑکی چلا گیا تھا۔ وہ اب اوورسیر ہے۔ غرضکہ ان خیالات سے انٹرنس کی عزت ان کے دل میں بہت کچھ تھی۔ ساری امیدیں مادھو کے انٹرنس پاس کرنے پر موقوف تھیں۔ انٹرنس کے درجہ سے ان کو اس قدر حسن ظن تھا کہ مرزا عابد حسین کی پریشان حالی ان کے چشمہ سے نظر ہی نہ آسکتی تھی۔ جب سے ان کو دیکھا تھا اور یہ سنا تھا کہ یہ انٹرنس پاس ہیں،

دل میں کہتے تھے۔ پرمیشر وہ دن کرے کہ مادھو بھیا بھی انٹرنس پاس کرلیں۔ مگر ابھی وہ دن دور ہے۔ چار پانچ برس باقی ہیں۔ اب کوئی گھر پر پڑھانے والا بھی نہیں۔ دل میں ایسے ہی کچھ خیالات تھے کہ ایک ہی مرتبہ مرزا عابد حسین سے پوچھا۔

بلدیو ۔ آپ کا دولت خانہ کہاں ہے ؟

عابد حسین ۔ چوک کے پاس۔

بلدیو ۔ اوہو۔ آپ بہت دور رہتے ہیں۔

عابد حسین ۔ (اس سوال کے رخ سے کچھ اپنے مطلب کی فال لیا چاہتے تھے) کیوں ؟

بلدیو ۔ کچھ نہیں۔ اگر کہیں پاس مکان ہوتا تو مادھو بھیا گھنٹہ دو گھنٹہ آپ سے پڑھ لیا کرتے۔

عابد حسین ۔ پھر دور مکان ہے تو کیا ہے۔ میں تو اس طرف آیا ہی کرتا ہوں۔

بلدیو ۔ کیوں ؟

عابد حسین ۔ یونہی نوکری کی تلاش میں۔

بلدیو ۔ اچھا تو آپ مادھو کو پڑھا دیا کریں گے ؟

عابد حسین ۔ بڑی خوشی سے۔

بلدیو ۔ میں جو ماسٹر جانکی پرشاد کو دیتا تھا۔ آپ کو بھی دوں گا۔

عابد حسین ۔ ان کو کیا دیتے تھے ؟

بلدیو ۔ پانچ روپیہ مہینہ۔

عابد حسین ۔ بہتر ہے۔ میں پڑھا دیا کروں گا۔

مادھو ۔ تو پھر کب سے آئیے گا ؟

عابد حسین ۔ جب سے کہو ۔
مادھو ۔ آٹھ دن ہمارے امتحان کو رہ گئے ہیں۔ اگر کل ہی سے آئیے تو اچھا ہے۔
عابد حسین ۔ کل ہی سے آؤں گا۔ کس وقت آیا کروں ؟
مادھو ۔ صبح کو آئیے یا شام کو۔ یہی دو وقت ہیں۔
عابد حسین ۔ اچھا تو میں صبح کو سات بجے پہنچ جایا کروں گا

خط تمام ہو چکا تھا۔ باتوں میں یہ مطلب بھی نکل آیا۔ اب وہاں ٹھہرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ جو شخص ان کو ساتھ لایا تھا اس نے بلدیو سے اکے کے لیے کہا۔ معلوم ہوا ہے کہ اکہ والا کہیں سواری لے کر گیا ہے۔ اس لیے اس نے ایک چونی نکال کے مرزا عابد حسین کے ہاتھ پر دھری۔ پہلے تو انھوں نے انکار کیا اس خیال سے کہ بلدیو کی نگاہ میں ذلیل نہ ہو جاؤں۔ مگر بلدیو نے خود کہا۔ میاں صاحب لے لیجیے حسین گنج سے اکہ کر لیجیے گا۔ رات زیادہ ہو گئی ہے اور پھر آپ سویرے آنے کو بھی کہتے ہیں۔ جلدی سے گھر پہنچ جائیے گا۔ مرزا عابد حسین نے چونی لے کے جیب میں رکھی اور کارخانے سے روانہ ہوئے۔

عابد حسین کی حالت سخت مایوسی کی تھی۔ اتنا سہارا جو ملا جان میں جان آئی۔ اب گھر کی طرف جلد سے جلد قدم اٹھنے لگے۔ راستے میں اکے بہت سے ملے مگر گھر میں بیوی بچوں کو اس حالت میں چھوڑ کے آئے تھے خیال کیا کہ اب اگر اکہ کرتا ہوں تو کم سے کم دو آنے فضول خرچ ہو جائیں گے۔ چار آنے میں دو وقت روٹی چل سکتی ہے۔ تھوڑا جبر اور گوارا کرو۔ پاپیادہ پہنچ ہی جاؤ گے۔ بارے جس طرح ہو سکا گھر پہنچے۔

رات کے دس بج گئے تھے۔ دروازے پر آ کر کنڈی کھڑکھڑائی۔ بیوی نے اٹھ کے دروازہ کھولا۔ دیکھا گھر میں چراغ جل رہا ہے۔ حیرت ہوئی کہ تیل

کہاں سے آیا اور یہ حیرت اور بھی زیادہ ہوئی جب بیوی نے ان کے بیٹھنے کے ساتھ ہی دستر خوان لاکے بچھایا۔ کھانا نکال کے آگے رکھا۔ انھیں ہاتھ دھونے کو پانی دیا۔ خود ہاتھ دھویا۔ کھانے کو آکے بیٹھ لیں۔

عابد ۔ ہائیں یہ سب کہاں سے آیا۔؟

بیوی ۔ وہی ٹوپی آج بکی نا۔

عابد ۔ کمال کیا۔ ٹوپی تیار کرلی اور بکوا بھی لی۔

بیوی ۔ تو پھر کیا کرتی۔؟

عابد ۔ بڑا کام کیا۔ بچے کھا چکے؟

بیوی ۔ بچوں کو ماشاءاللہ دوسرا پہر لگا ہے۔ ابھی تو کھا پی کے سوئے ہیں۔

عابد ۔ اور تم نے کچھ نہیں کھایا؟

بیوی ۔ اب تمہیں میری کیا فکر پڑ گئی۔ لو کھاؤ۔

عابد ۔ واہ کیا میں جانتا نہیں تم یونہی بیٹھی ہوگی۔ کیا بری عادت ہے۔

بیوی ۔ اور تمہیں یہ دیر آج کہاں لگی؟ روز تو سویرے آجایا کرتے تھے۔؟

عابد حسین نے اپنا تمام واقعہ سرے سے آخر تک مفصل سنایا۔ بیوی سن کے باغ باغ ہوگئیں۔ مرزا عابد حسین کی بیوی ان بیویوں میں نہ تھیں جو خواہ مخواہ اپنے شوہروں کی شکایت کیا کرتی ہیں۔ اس موقع پر انھوں نے میاں کی جو دلجوئی اور تسکین کی وہ قابل ہزار آفریں ہے۔

بیوی ۔ خدا نے میرے بچوں پر رحم کیا۔

عابد ۔ ہاں سہارا تو ہوگیا ہے مگر پانچ روپے میں کیا ہوگا؟

بیوی ۔ خدا کا شکر کرو تنک کا سہارا بہت ہوتا ہے۔ پانچ روپے بہت ہوتے ہیں۔ خدا نے چاہا تو اب فاقہ نہ ہوگا۔ میری ٹوپی بھی اب روپے کو بکنے لگی ہے۔

مہینہ میں چار ٹوپی اگر تیار ہوں گی تو چار روپئے کہیں نہیں گئے ہیں۔ تم اپنا دل مضبوط رکھو۔

عابد :۔ میرا دل مضبوط ہے۔

دونوں میاں بیوی نے کھانا کھایا۔ خدا کا شکر کیا۔ نمازیں پڑھیں۔ سو رہے

دوسرے دن صبح کو سات بجتے بجتے مرزا عابد حسین بلدیو مستری کے کارخانے میں پہنچ گئے تھے۔ مادھو بہت ہی شوقین لڑکا تھا۔ وہ صبح چھ بجے ہی سے کتابیں کھول کر پڑھنے بیٹھ گیا تھا۔ عابد حسین نے پہلے انگریزی کتاب کا سبق پڑھایا۔ ہر ایک مشکل لفظ کے ہجے اور معنی پوچھے۔ پھر املا لکھوایا۔ اس میں صرف ایک غلطی نکلی۔ اسے درست کر دیا۔ اس کے بعد گرامر (صرف و نحو) کا سبق ہوا۔ اب اردو کی باری آئی۔ مادھو اردو میں بہت ہی کمزور تھا۔ حرفوں کا تلفظ صحیح نہیں بتایا گیا تھا۔ شین قاف تک درست نہ تھا۔ اس میں عابد حسین کو بڑی محنت کرنا پڑی۔ پھر حساب شروع ہوئے۔ کل درجے میں جو سوالات مادھو کو دیے گئے تھے وہ اس نے رات ہی کو لگا رکھے تھے۔ عابد حسین نے قاعدۂ عمل بڑے غور سے جانچ کے جہاں جہاں خامی تھی اسے درست کر دیا۔ مادھو کے انگریزی اور فارسی دونوں خط ٹھیک نہ تھے اور نہ اسے اس طرف زیادہ توجہ تھی مگر عابد حسین نے دو کاپیاں اسی دن بنوائیں اور اپنے سامنے لکھوانا شروع کیا۔ جو لوگ اس سے پہلے مادھو کو پڑھاتے تھے۔ وہ بہت سا وقت باتیں کرنے میں صرف کیا کرتے تھے۔ مادھو کو اس کی عادت پڑی ہوئی تھی مگر عابد حسین باتیں کرنا جانتے ہی نہ تھے۔ ابتدائے عمر سے انھیں محنت کی عادت تھی۔ ماں باپ نے ایسی صحبتوں میں بیٹھنے ہی نہ دیا جس سے مذاق کا مفہوم ان کے ذہن میں سما جاتا جس سے ان کو یہ معلوم ہوتا کہ فضول گپیں اڑانا

بھی حفظانِ صحت کے اصول میں داخل ہے۔ لکھنؤ کے اکثر صاحبزادوں کو عنفوانِ شباب سے عشق بازی کا لپکا پڑ جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی شعروسخن کی طرف طبیعت مائل ہوتی ہے۔ اس بہانے سے اکثر ناجائز تخیلات کو عمدہ الفاظ کے پیرائے میں ادا کرنے کا اچھا موقع مل جاتا ہے۔ ان بلاؤں سے خدا نے ان کو محفوظ رکھا تھا۔ ابھی پورے جوان بھی نہ ہونے پائے تھے کہ ان کے والد مرحوم نے ازراہِ دوراندیشی ان کی شادی کر دی۔ شادی کے دوسرے ہی سال ان کے اولاد ہوئی۔ اس سے چند ہی روز بعد خانہ داری کا تمام بار ان کی گردن پر پڑ گیا جس سے آج تک سر اٹھانے کی مہلت نہ ملی۔ نہ انھیں یاروں کے ساتھ راتوں کو پھرنے کا اتفاق ہوا تھا، نہ اونچے کوٹھوں تک ان کی نیچی نظریں اٹھنے پائی تھیں، نہ رقص و سرود کی محفلوں میں انھیں بیٹھنے کا موقع ملا تھا۔ غرضکہ یہ اس کوچے سے بالکل ہی نابلد تھے۔

القصہ مادھو سے انھوں نے پورے دو گھنٹے محنت لی اور خود بھی دم نہ لیا۔ اس اثنا میں بلدیو کئی مرتبہ کسی نہ کسی بہانے سے اس کھپریل میں آ کے ان کا پڑھانا دیکھ گیا۔ یہ ابھی تھوڑی دیر اور پڑھاتے مگر اب نو بج گئے تھے۔ مادھو کے اسکول جانے کا وقت تھا۔ یہ اپنی جگہ سے اٹھے ہی تھے کہ بلدیو مستری نے انھیں اشارے سے بلایا اور ایک فردِ حساب کی نکال کے پڑھوائی۔ اس میں کاریگروں کے چھٹے کی تفصیل تھی۔ شنکر لوہار اور ماتادین بڑھئی کے حساب میں کچھ گنجلک تھی۔ اسے صاف کرا لیا۔ ان کا نام بھی مع شرحِ تنخواہ اسی فرد میں لکھوا دیا۔ اب یہ گھر روانہ ہوئے۔

بلدیو کے کارخانے میں اور تو کوئی ایسی بات نہ تھی جو ان کے دل میں کوئی خاص اثر کرتی۔ مگر بھاری ہتھوڑوں کی آوازیں اور بڑی دھونکنیوں کی جھنکاریں

ابھی تک ان کے کانوں میں گونج رہی تھیں ۔ لوہے کا سرخ ہوکر بھٹی سے نکلنا۔
نہائی پر رکھا جانا اور اس پر تواتا ہاتھوں کی چوٹوں سے شراروں کا اڑنا تخیل
کے پردوں پر منقش ہوگیا تھا۔ محنت اور جفاکشی کی مجسم صورتیں آنکھوں میں پھر
رہی تھیں ۔ ضرورت اور مفلسی اہلِ حرفہ کے ذلیل اور کم رتبہ ہونے کے بیہودہ
اعتقاد کو جو دولت، آرام طلبی اور تن آسانی کے منحوس اثر سے دلوں میں مدت
ہائے دراز سے راسخ ہوگیا ہے اب ان کے دل سے ہٹا رہی تھیں ۔ بلدیو مستری کے
کارخانے میں کسی کاریگر کا روزینہ چھ آنے روزانہ سے کم نہ تھا ۔ انھوں نے اپنے
روزینہ کا حساب لگایا ۔ صرف ڈھائی آنہ روز سے کچھ کوڑیاں اوپر ہوئیں ۔ اس
حساب سے بھی سب سے کمتر ٹھہرے ۔ یہ خیال دل میں آیا ہی تھا کہ حسب نسب
کے توہمات نے آکے گھیرا اور اس کے ساتھ ہی ایک قسم کا غرور دل میں چکر
کھانے ہی کو تھا کہ انھوں نے اسے ایک شیطانی وسوسہ تصور کرکے لاحول پڑھی ۔
دادا جان رسالہ دار تھے ۔ لیکن خیریت سے وہ رسالہ غدر سے پہلے ہی شکست
ہوگیا تھا ۔ نانا جان نواب زادے تھے مگر خاندانی پنشن ان ہی کے حین حیات
تھی، اب اس کا ثلث کیسا ایک حبہ بھی ہمیں نہیں ملتا ۔ دادی اماں کے پاس
چالیس لونڈی غلام تھے مگر بیوی اپنے ہاتھ سے چولھا پھونکتی ہیں ۔ بڑے
ماموں خدا بخشے فیل نشیں تھے مگر میں جوتیاں چٹخاتا پھرتا ہوں ۔ پانچ
روپیہ کی نوکری ایسی چیز ہے کہ اس کے لیے سویرے اٹھ کے محمود نگر سے
نہر کے اس پار کوئی تین میل کے فاصلہ پا پیادہ جاتا ہوں اور اب قریب
دس بجے کے گھر جاتا ہوں ۔

فاقہ میں نہ عالی نسبی کام آئی نہ والاحسبی ۔ دو حرف جو پڑھ لیے تھے
اس سے بلدیو تک رسائی ہوئی اور پانچ روپے کا سہارا ہوگیا ۔ آیندہ بھی

جو کچھ امید ہے اسی سے ہے۔ ان مہمل خیالات سے کچھ کام نہ چلے گا۔ بہتر ہے کہ انھیں یہیں سے رخصت کر دو اور گنگا پار کی طرف کا راستہ بتا دو۔

اسی انتشار میں یہ خیال آیا کہ آخر گھر تو جاتے ہی ہو حضرت گنج کی طرف سے ہو کر نکل چلو۔ آڈٹ آفس میں کل عرضی دی تھی۔ بڑے بابو نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ کوئی جگہ خالی نہیں۔ مگر صاحب کے ملاحظے کے لیے عرضی رکھ لی تھی۔ شاید صاحب نے کوئی حکم موافق چڑھایا ہو۔ ذہن نے ابھی اس بات کا فیصلہ نہ کیا تھا کہ چلنا چاہیے یا نہیں اور نہ ابھی وہ مقام آیا تھا جہاں سے حضرت گنج کو راستہ مڑتا ہے۔ اب یہ نہر کے پل پر تھے۔ یہاں سے چند ہی قدم آگے بڑھے ہوں گے کہ ایک کباڑیے کی دکان پر نظر جا پڑی۔ یہاں بہت سی پرانی کتابیں تلے اوپر رکھی تھیں۔ جی میں آیا ان کتابوں میں دیکھو، شاید کوئی مطلب کی ہو۔ یہ امنگ دل میں اس لیے پیدا ہوئی تھی کہ رات والی چونی ابھی تک جیب میں پڑی پڑی تھی۔ فوراً ہی افلاس نے اپنی مہیب صورت دکھا کے چشم نمائی کی۔ انھوں نے ادھر سے منہ پھیر لیا۔ آگے بڑھے۔ اب وہ مقام آگیا جہاں سے حضرت گنج کو سڑک جاتی ہے۔ یہاں انھیں چند لمحہ ٹھہرنا پڑا۔ پھر یہ سوچ کے کہ ابھی سویرا ہے آڈیٹر صاحب گیارہ بجے دفتر میں آتے ہیں۔ اس وقت وہاں جا کر کیا کرو گے۔ ایسا ہے تو کبھی چلے جانا۔ گھر کی طرف کا راستہ لو۔ اس کے بعد راستہ میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا جس کا بیان ان کے ذہنی تغیرات کو سمجھانے کے لیے ضروری ہو۔ صرف انھوں نے ایک بات دیکھی اور خوب سمجھے کہ صدر بازار سے لے کر امین آباد تک راستہ میں جو لوگ ملے ان کے چہروں سے ایک خاص قسم کی سنجیدگی اور غور کے آثار پائے جاتے تھے۔ ان کے لباس میں ایک طور کی بے پروائی اور سادگی نمایاں تھی۔ ان کی رفتار میں

وہ صفت پائی جاتی تھی جسے سرعت کہتے ہیں۔ ان سب علامتوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کاروباری آدمی ہیں۔ ان مقاموں میں ان کو فقیر بہت کم ملے اور نہ کوئی مفلس سفید پوش نظر آیا۔ بخلاف اس کے امین آباد سے ہو کے جب مولوی گنج میں پہنچے ہیں تو ان کو بہت سے آدمی ایسے ملے جن کے ہاتھ میں بٹیروں کی کابک ہے۔ کوئی گنا چھیلتا چلا جاتا ہے۔ کوئی صاحب راستے میں کھڑے تانیں اڑا رہے ہیں۔ کوئی کسی پر پھبتی اڑا رہا ہے۔ دو چار کسی بازاری عورت سے سرِ راہ مذاق کر رہے ہیں۔ دو ایک بے فکرے کسی نیک بخت عورت کو نہیں معلوم کہاں سے گھیرے چلے آتے ہیں۔ وہ بیچاری ڈر کے مارے گھونگھٹ سے منہ چھپائے لیتی ہے۔ جلد جلد قدم اٹھائے چلی جاتی ہے۔ یہ ہیں کہ آوازے کس رہے ہیں۔ کہیں دو بے تکلف دوستوں میں گالی گلوج ہو رہی ہے۔ کہیں دو آدمیوں میں مارپیٹ ہو رہی ہے۔ بہت سے آدمی جمع ہو گئے ہیں۔ کہیں بندر کا ناچ ہو رہا ہے۔ راستے میں اس قدر بھیڑ ہے کہ راستہ چلنا مشکل ہے۔ غرض کہ اکثر آدمی ایسے ہی تھے جن کے اطوار سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کو دنیا و مافیہا میں کوئی کام نہیں۔ محض نکمے ہیں۔ سوائے تمسخر اور تضیع اوقات انھیں کوئی بات کی فکر نہیں۔ بہت سے ایسے ملے جن کی صورت ہی سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان پر غم کا آسمان ٹوٹ پڑا ہے۔ خدا جانے کے فاقے کڑاکے کے گذر چکے ہیں۔ ان گلی کوچوں میں فقیر بھی بہت سے ملے مگر کاب گنج سے یحییٰ گنج کے پھاٹک تک جہاں دو طرفہ لوہیوں، کسیروں اور ٹھٹھیروں کی دکانوں میں بھی ایک قسم کی چہل پہل نظر آئی۔ اس بازار میں بے فکرے کم نظر پڑے۔ یحییٰ گنج کے پھاٹک سے نخاس تک اور وہاں سے ان کے مکان تک شہر کے بانکے ترچھے بد وضع لوگوں کا تو گویا رمنہ ہے۔ یہ تماشہ دیکھتے بھالتے

اپنے گھر پہونچے۔ کھانا پکا پکایا تیار رکھا تھا۔ بچے کھیل رہے تھے۔ بیوی
روٹی کاڑھ رہی تھیں۔ ان کے جانے کے ساتھ ہی دستر خوان بچھا، میاں
بیوی، لڑکا، لڑکی سب نے ایک ساتھ مل کے کھایا۔ اب وقت قریب
گیارہ بجے کے تھا۔ اس وقت سے دوسرے دن صبح کو چھ بجے تک کوئی
کام اور نہ تھا۔ حساب سے انیس گھنٹے ہوئے۔ اگر ان میں سے سات گھنٹے
رات کے سونے کا حق نکال ڈالیں تو بھی گیارہ گھنٹے بچتے ہیں۔ نکمّے اور
وقت کے فضول ضائع کرنے والے اس میں بہت سا وقت دن کو سو کے
کاٹ دیتے ہیں۔ مثلاً گیارہ بجے سے تین بجے تک۔ پھر تین بجے سے پانچ
بجے تک نہانے دھونے، بالوں میں کنگھی کرنے، تیل ڈالنے، مانگ
پٹیاں درست کرنے، کپڑے بدلنے میں بخوبی صرف ہو سکتے تھے۔ اس
کے بعد چوک کی سیر کو نکل جاتے۔ ادھر ادھر واہی تباہی میں پڑے پھرتے۔
اس طرح سات بج جاتے۔ اب کسی دوست کی ملاقات کا وقت آجاتا۔ وہاں
وہاں صرف باتیں کرنے میں یا کسی اور شغل مثلاً گنجیفہ، چوسر، شطرنج وغیرہ میں
تین چار گھنٹے بڑے لطف کے ساتھ بسر ہو سکتے تھے۔ ہمارے دوست مرزا
عابد حسین ایسے لوگوں میں نہ تھے۔ ان کو اپنے اور اپنے اہل وعیال کے آذوقہ
کی فکر تھی۔ تقدیر کی بے جا شکایت نہ انھوں نے کسی کتاب میں پڑھی تھی اور نہ
ان کی تخئیل سے اختراع کر سکتی تھی۔ اس لیے کہ یہ کسی فلک زدہ شاعر کی
صحبت میں کبھی نہیں بیٹھے تھے اور نہ انھوں نے کسی نجومی رمّال سے اپنے
دن دکھوائے تھے۔ وقت کو کسی مفید کام میں صرف کرنے کی دھن ان
کے دل میں سمائی تھی۔ انھوں نے کسی کتاب میں پڑھ لیا تھا کہ وقت کا
ایک لمحہ سونے کے ریزوں کی طرح قیمتی ہے۔ ان کو ان ریزوں کے جمع

کرنے اور اس سے سونے کی تھکیا بنانے کی فکر تھی۔ مگر اس کی ترکیب انھیں نہیں آتی تھی۔ یہ مہندس کی طرح اس نسخہ کی فکر میں تھے مگر ابھی تک کوئی استاد کامل نہ ملا تھا۔ اب مجبوری نے سہارا دیا تھا کہ ہم یہ نسخہ بتا دیں گے۔

کھانا کھانے کے چند منٹ کے بعد انھوں نے اپنی تمام کتابیں جو انٹرنس اور نیچے درجوں میں جو پڑھی تھیں انھیں نکالا۔ ان میں سے سوائے تین کتابوں کے کوئی ایسی کتاب نہ تھی جو سرے سے آخر تک ان کی کئی کئی مرتبہ کی پڑھی ہوئی نہ ہو۔ ان کتابوں میں سے ایک تو الجبرہ تھا جو صرف مساوات درجہ اول تک پڑھایا گیا تھا۔ اور نصف سے زیادہ ابھی پڑھنے کو باقی تھا۔ دوسری یوکلڈ (تحریر اقلیدس) جس کے صرف اول چار مقالے پڑھے تھے۔ پانچواں، چھٹا اور گیارہواں، بارھواں چھوٹ گیا تھا تیسرے منسوریشن۔ اس میں صرف سطوح کا بیان دیکھا تھا۔ مجسمات سے بالکل ہی ناواقف تھے۔ یہ کتاب بھی نصف سے زیادہ پڑھنے کو باقی تھی۔ علم ریاضی سے ان کو خاص شوق تھا۔ ریاضی کے گھنٹہ میں اکثر ان ہی کے نمبر بڑھ جاتے تھے۔ ان سے اتر کے دیبی پرشاد تھا۔ اس نے انٹرنس پاس کر کے رڑکی کے داخلہ کا امتحان دیا اور اس میں کامیاب ہوا۔ اب اوورسیر کلاس میں پڑھتا ہے۔ ڈیڑھ برس کے بعد پچھتر روپئے کا ملازم ہو جائے گا۔

ان کتابوں کو پہلے تو انھوں نے حسرت کی نگاہ سے دیکھا۔ اس خیال سے کہ ان کے پڑھنے کا موقع ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ ساتھ کے طالب علم اکثر ایف۔ اے کلاس میں پڑھتے ہیں۔ افسوس! اگر ممکن ہوتا تو ہم بھی پڑھتے وقت تو ہے۔ مادھو کو پڑھا کے ادھر ہی کالج چلے جایا کرتے تھے مگر فیس ادا کرنے کا مقدور ہے نہ کتابیں خرید سکتے ہیں۔ اور اگر یہ بھی ہوتا تو اب

چھ مہینے سے زیادہ زمانہ گذر گیا۔ ساتھ والے کہاں سے کہاں پہنچے ہوں گے۔
اب کیا ہو سکتا ہے۔ رڑکی کالج میں بھی داخلہ ناممکن ہے۔ اگر امتحان کے لیے
تیاری کی اور پاس بھی ہو گئے مگر وظیفہ نہ ہوا تو اور صدمہ ہوگا۔ دوسرے اس
کے امتحان کے لیے کسی قدر نقشہ کشی کی ضرورت ہے وہ کیونکر سیکھ سکتے ہیں۔
اس میں آلات کے بکس کی ضرورت ہے۔ غرض کہ مفلسی نے ہماری ترقی کی
راہیں مسدود کر دی ہیں۔ کچھ بن نہیں پڑتا۔ کیا کیا جائے۔ مگر کچھ نہ کچھ کرنا
چاہیے۔ بے کار بیٹھنا اچھا نہیں۔ اب تو آڈٹ آفس چلنا چاہیے۔

ایک بجے کے قریب آڈٹ آفس پہنچے۔ عرضی پر وہی معمولی جواب
ملا (نو ویکینسی) کوئی جگہ خالی نہیں۔ اس جواب کے ملنے سے انھیں کچھ ایسا
رنج نہیں ہوا۔ اس لیے کہ اس کی توقع پہلے ہی سے تھی۔ دفتر سے باہر
نکل کر یہ چلنے ہی کو تھے کہ رضا حسین ان کے اسکول کا ایک طالب علم جس
نے چوتھے درجے تک پڑھ کے چھوڑ دیا تھا، اس سے ملاقات ہو گئی۔

عابد حسین :- تم یہاں کہاں ؟

رضا حسین :- جی میں تو یہاں نوکر ہوں۔

عابد حسین :- کاہے میں نوکر ہو ؟

رضا حسین :- ٹریسروں میں۔

عابد حسین :- بھئی ٹریسر کسے کہتے ہیں ؟

رضا حسین :- نقشوں کا عکس اتارتا ہوں۔

عابد حسین :- کیونکر ؟

رضا حسین :- اے لیجیے۔ آپ کو آج تک یہی نہیں معلوم۔ چلیے دکھا دوں۔
رضا حسین ان کو اپنے دفتر میں لے گیا۔ یہاں انھوں نے دیکھا کئی آدمی

اونچی میزیں لگی ہیں۔ ان پر نقشے بچھے ہوئے ہیں۔ ان پر ایک قسم کا باریک موم جامہ (جسے یہ پہلے کاغذ سمجھتے تھے) بچھا کر پیتل کی کیلوں سے جڑ دیا ہے جس سے نیچے تو کچھ بنا ہوا ہے، اوپر صاف نظر آتا ہے۔ اوزاروں کے بکس کھلے ہوئے رکھے ہیں۔ کچھ لوگ کھڑے اور کچھ اونچی تپائیوں پر بیٹھے خط پر خط کھینچ رہے ہیں اور حرف پر حرف لکھ رہے ہیں۔ کوئی رنگ کی پیالیاں آگے رکھے رنگ دے رہا ہے۔ انھوں نے یہاں کی ہر چیز کو بڑے غور سے دیکھا اور جو بات سمجھ میں نہ آئی اس کو ان لوگوں نے بڑی مہربانی سے بتایا۔ اتنے میں چپراسی نے کہا، صاحب آتے ہیں۔ انھوں نے ارادہ کیا کہ میں دفتر سے باہر چلا جاؤں۔ ان لوگوں نے کہا کہ جی نہیں۔ صاحب کچھ نہیں کہیں گے۔ آپ ٹھہر جائیں۔ ایک تپائی پاس رکھی تھی اس پر انھیں بٹھا دیا۔ صاحب دفتر میں آیا۔ سب لوگوں کا کام دیکھا۔ یہ ایک اجنبی آدمی تھے۔ ان سے دریافت کیا۔ آپ کون؟ یہ گھبرا سے گئے۔ رضا حسین نے جواب دیا۔ میرے پاس آتے ہیں۔ صاحب نے دریافت کیا ٹریسر کا کام جانتا ہے۔ رضا حسین نے جھوٹ موٹ کہہ دیا۔ اجی ابھی سیکھتے ہیں۔ صاحب تو دفتر سے چلے گئے۔

عابد حسین :۔ تم نے خوب کہی کہ سیکھتے ہیں۔

رضا حسین :۔ پھر اور کیا کہتا۔؟

عابد حسین :۔ اچھا تو اگر میں سچ مچ سیکھوں تو سکھا دو گے؟

رضا حسین :۔ میں تو کیا۔ مگر استاد نبی بخش سے کہو۔

استاد نبی بخش نقشہ نویس رڑکی کالج کے سند یافتہ پاس بیٹھے کام کر رہے تھے۔ انھوں نے مذاق سے کہا۔

مگر حضرت مٹھائی دینا ہوگی۔

عابد حسین :۔ مٹھائی حاضر ہے مگر یہ تو بتائیے کتنے دنوں میں یہ کام آ جائے گا ؟

نبی بخش :۔ یہ بھی اسی وقت بتا دیا جائے گا جب مٹھائی دیجئے گا۔

عابد حسین :۔ واقعی مذاق نہیں۔ میرا ارادہ اس کام کے سیکھنے کا ہے۔ اگر آپ مہربانی کریں تو میں ممنون ہوں گا۔

نبی بخش :۔ میں بھی مذاق سے نہیں کہتا۔ عکس کشی تو کوئی چیز نہیں۔ اگر آپ سیکھنے کا قصد کریں تو نقشہ کشی سکھادی جائے گی اور آپ تو انگریزی پڑھے ہیں۔ آپ کو بہت اچھی جگہ مل جائے گی۔

رضا حسین :۔ اچھا استاد تو پھر ہمارے مرزا صاحب کو سکھا دیجیے۔ بیچارے بے روزگار ہیں۔ کار سے لگ جائیں گے۔

نبی بخش :۔ (کسی قدر رد کھے ہو کے مگر مسکرا کے) بھئی تم جانتے ہو کہ میں بغیر مٹھائی کے تو سکھاتا نہیں۔

عابد حسین :۔ اچھا تو میں کل سے حاضر ہوں گا۔ مٹھائی لیتا آؤں گا۔

رضا حسین :۔ یہ کل کیوں ؟ کیا مٹھائی کے لیے دام نہیں ہیں ؟

عابد حسین کچھ چپ سے ہو گئے۔

رضا حسین :۔ (ایک روپیہ جیب سے نکال کے ایک چپراسی سے) اماں نوروز علی ، ایک روپیہ کی مٹھائی تو لے آؤ۔ استاد بھی کیا کہیں گے کہ منہ میٹھا نہیں کیا۔ نوروز علی روپیہ لے کے گیا اور چند ہی منٹ کے بعد مٹھائی کی ٹوکری لے کے آ گیا۔ جتنے عکس کش، چپراسی وغیرہ وہاں موجود تھے، سب میں دو چار ڈلیاں تقسیم ہو گئیں۔ عابد حسین نبی بخش نقشہ نویس کے شاگرد ہوئے۔

نبی بخش :۔ سنیے مرزا صاحب! عکس کشوں کی آج کل ہے ضرورت۔ صاحب

آپ کو دیکھ ہی چکے ہیں۔ آج کے آٹھویں دن آپ بیس روپے مہینے کے نوکر ہو جائیں گے۔ عکس کشی کوئی چیز نہیں ہے۔ رہی نقشہ نویسی اس کے لیے ایک عمر چاہیے۔ جتنی مجھے معلوم ہے اس کے بتانے میں دریغ نہ کروں گا باقی اگر آپ کو شوق ہوگا تو اپنے آپ سیکھتے رہیے گا۔ عابد حسین آٹھویں دن نوکر ہو جانے کی خوش خبری سن کے قریب تھا کہ شادی مرگ ہو جائے۔ مگر وہ روپیہ جو رضا حسین نے ان کی طرف سے دے دیا تھا اس کی ادائیگی کی فکر نے کسی قدر ان کی مسرت کو بے لطف کر رکھا تھا۔ اتنے میں ایک ٹکڑا ٹریسنگ کلاتھ کا اٹھا کے نبی بخش نے ان کے سامنے رکھا اور ایک جدول قلم میں سیاہی بھر کے بتا دیا کہ اسے لیجیے اس طرح سے خط کھینچیے۔ انھوں نے خط کشی شروع کی۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے عرصے میں موٹے مہین خط ان کے ہاتھ سے نکلنے لگے۔ اس اثنا میں نبی بخش نے ان کی انگریزی تحریر دیکھی۔ ان کا انگریزی خط بہت پاکیزہ تھا۔ منشی نبی بخش نے چھاپے کے حروف لکھنے کا طریقہ بتا دیا اور ایک باریک قلم اور تھوڑا ردی ٹریسنگ کلاتھ دیا کہ اس پر ان حرفوں کے لکھنے کی مشق کیجیے۔ چار بجے تک انھوں نے بڑی محنت سے کام کیا۔ جب دفتر برخاست ہوا اور لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے یہ بھی ان کے ساتھ ہو لیے۔

آج اِن کو معلوم ہوتا تھا کہ گویا میں نوکر ہو گیا۔ رضا حسین شاہ گنج کی طرف کے رہنے والے تھے۔ ان کا ساتھ بہت دور تک ہوا۔ راستہ میں باتیں ہوتی جاتی تھیں۔ پانچ بجتے بجتے یہ گھر پہنچے۔

مرزا عابد حسین کو اپنی زندگی میں جس قدر کامیابیاں ہوئیں (جس کا حال اس کتاب کے ملاحظہ سے ہوگا) اس میں ان کی نیک بخت بیوی کی صلاحیت کو بڑا دخل تھا۔ ان میاں بیوی کے باہمی محبت کے اصول میں سے ایک یہ بات تھی کہ ایک کو دوسرے کی نیکی پر پورا بھروسہ تھا۔ میاں کے کاموں پر بیہودہ نکتہ چینی کرنا، جو ایک عمدہ صفت ہمارے ملک کی عورتوں میں ہے، ان کی بیوی میں نہ تھی۔ بیوی میاں کی عزت کرتی تھیں اور سمجھتی تھیں کہ ان کو گھر کا خیال اور بچوں کی محبت اسی طرح ہے جس طرح مجھے ہے۔ عابد حسین میں رات دیر تک گھر سے غائب رہنے کی عادت نہ تھی۔ اگر حسنِ اتفاق سے کہیں دیر ہوتی تھی تو بیوی کو کسی قسم کی بدگمانی نہ ہوتی تھی۔ نہ یہ کہ اگر کہیں میاں کو دیر ہوگئی۔ اب گھر میں آئے تو بیوی نے ماتا مت ڈال دی۔ قیامت برپا کی "نہیں تم رنڈی کے یہاں گئے تھے" میاں اگر واقعی خطاوار ہیں تو خیر۔ اگر ناکردہ گناہ اس سرزنش کے مستوجب ٹھہرتے ہیں تو اب جزبز ہو رہے ہیں قسمیں کھاتے ہیں۔ قرآن اٹھاتے ہیں وہاں سماعت ہی نہیں۔

میاں :۔ بیوی تمہارے سر کی قسم مسجد سے نماز پڑھ کے مولوی صاحب قبلہ کے پاس گیا تھا۔ شکیات نماز میں کچھ دریافت کرنا تھا۔

بیوی :۔ وہ کون سا مولوی اجڈا ہے جو تمہیں نو نو بجے تک بٹھا رکھتا ہے۔ یہ نہیں کہتے اپنی چہیتی کے یہاں گئے تھے۔ خدا غارت کرے موئی کو۔ ہیضہ کھائے۔ ڈھائی گھڑی کی موت آئے۔ زور سے ایک دوہتڑ زمین پر مارا۔ دیکھ لینا۔ ہوں اصل نسل کی سیدانی۔ موئی کو اٹھوارہ نہ گذریگا۔ کوس کوس کے کھا جاؤں گی۔

میاں :۔ یہ کس کو؟

بیوی :۔ یہ اس کو جو تمہیں آدھی آدھی رات تک بٹھا رکھے۔

مفلسی کے زمانے میں بیوی کے زیور اور اسباب کو بیچ بیچ کر وہ جو اپنے باپ کے گھر سے لائی تھیں، بہت دنوں تک کام چلتا رہا۔ یہاں تک کہ چاندی کا ایک تار اور تانبے کا کٹورا تک باقی نہ رہا۔ اب تک بہت دنوں سے بیوی کی محنت کے ذریعے گھر کا کام چلتا تھا جس کا حال ناظرین کو معلوم ہو چکا ہے مگر اس کا طعنہ کبھی میاں کو نہیں دیا۔ آج جب سرِ شام عابد حسین خوش خوش دفتر سے پھرے ہیں تو ان کو خیال تھا کہ بیوی سے کل حال بیان کر دونگا مگر پھر یہ خیال آیا کہ اب ایک ہی دفعہ یاد رکھیں گے جس دن نوکر ہو جائیں گے۔

رات کو انھوں نے نقشہ بنانے کی سیاہی ایک چھوٹی سی پیالی میں گھولی اور دس گیارہ بجے تک پرنٹ (نقشہ کے حروف) کی مشق کرتے رہے۔

دوسرے دن صبح کو اٹھے۔ بلدیہ مستری کے کارخانے نہ گئے۔ نو بجے وہاں سے فراغت کرکے اُدھر ہی اُدھر ریل کے دفتر پہنچے۔ ابھی کوئی آیا بھی نہ تھا۔ یہ دفتر کے باہر ٹہلا کیے۔ جب سب آ گئے تو یہ بھی گئے۔ عکس کشی کی مشق کرنے لگے۔ آج صاحب نے پھر انھیں دیکھا مگر پوچھا نہیں۔ خلاصہ یہ کہ پانچ ہی چار دن کے بعد یہ اچھی طرح ٹریس کرنا سیکھ گئے۔ دفتر میں ٹریسروں کی ضرورت پہلے ہی سے تھی۔ نبی بخش نے صاحب سے کہہ کے ان کا نام بھی لکھوا دیا۔ بیس روپے مہینے کے نوکر ہو گئے۔ مادھو کا پڑھانا بھی انھوں نے ترک نہیں کیا۔ اگرچہ بہت سخت محنت پڑتی تھی۔ اکثر ایک ہی وقت کھانا ملتا تھا مگر دنیا بہ امید قائم۔ پچیس روپے کا سہارا ہو گیا تھا اب انھیں کسی بات کا غم نہ تھا۔ بیوی بھی مطمئن ہو گئی تھیں مگر انھوں نے اپنا کام نہیں چھوڑا۔ آٹھویں دسویں ان کی ٹوپی بھی تیار ہو جاتی تھی اور میاں حسین علی بیچ لایا کرتے تھے۔ بہت دنوں تک میاں حسنین علی

نے ایک حبہ حق السعی میں نہیں لیا مگر اب ایک آنہ روپیہ ان کا بھی مقرر ہو گیا۔ اس طرح تیس اتیس روپیہ میاں بیوی مل کے پیدا کر لیتے تھے۔

اگر کوئی شخص پست ہمت ہوتا تو وہ آئندہ اور کچھ ترقی نہ کرتا لیکن ہمارے دوست مرزا عابد حسین میں نہ وہ وصف تھا جسے توکل کہتے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو بیوی کی چکن دوزی کے سہارے پر چارپائی کے بان توڑا کرتے۔ اور نہ وہ صفت تھی جو قناعت کے نام سے مشہور ہے۔ ورنہ بلدیہ کی پانچ روپے کی نوکری کافی تھی۔ حیاتِ چند روزہ خوش و ناخوش گذر ہی جاتی۔ مگر زیادہ طلبی نے انکو چین نہ لینے دیا۔ دوپہر کو گھڑی بھر سو رہنے تک کی مہلت نہ ہوئی۔ ریل کے دفتر پہنچ گئے۔ خیر یہاں بیس روپے کی نوکری مل گئی مگر ان کی تقدیر میں اب بھی آرام نہ تھا۔ عکس کشی سے نقشہ کشی سیکھنے کا شوق ہوا۔ ان کے استاد نبی بخش صاحب رڑکی کالج کے پاس شدہ طالب علم تھے۔ انھوں نے یہ صلاح دی کہ اگر یہ کام اصول سے سیکھنا ہے تو پہلے تحریر اقلیدس کا چھٹا مقالہ یاد کر لیجیے۔ اب رات کو یہ چھٹا مقالہ یاد کرنے لگے۔ پہلے تو انھیں یہ خیال تھا کہ کہیں جا کے پڑھنا ہوگا۔ مگر غور سے جو مطالعہ کیا آپ ہی آپ سمجھ میں آنے لگا۔ غرض کہ پورا چھٹا مقالہ مع پانچویں مقالہ ان ضروری شکلوں کے جس کی چھٹے مقالہ میں ضرورت ہے، چند ہی روز میں یاد کر لیا۔ اب منشی نبی بخش نے ان کو نقشہ کشی کے اصول ہندسے سکھانا شروع کیا۔ دفتر میں کام سے فرصت نہ ملتی تھی۔ شام سے یہ منشی نبی بخش کے مکان پر پہنچتے تھے۔ منشی نبی بخش بھی اپنی دھن کے پکے تھے۔ ان کو انگریزی پڑھنے کا شوق تھا۔ خلاصہ یہ کہ یہ انھیں انگریزی پڑھاتے تھے اور وہ انھیں نقشہ سکھاتے تھے۔ نقشہ کشی کے ساتھ ہی تخمینہ عمارات کے سیکھنے کا شوق ہوا۔ اس کے لیے اقلیدس کا گیارھواں مقالہ اور علم مساحت مجسمات بھی حاصل کیا۔ چھ سات

مہینے میں یہ پورے نقشہ نویس اور اسٹیمیٹر ہو گئے۔ اسی زمانہ میں منشی نبی بخش کو ایک مہینے کی رخصت کی ضرورت تھی۔ صاحب نے عوضی طلب کی۔ منشی نبی بخش نے انھیں پیش کر دیا۔ صاحب نے منظور کر لیا۔ اس زمانے میں انھیں اپنی کار گزاری دکھانے کا بہت عمدہ موقع ملا۔ صاحب ان کے کام سے بہت خوش ہوا مگر ابھی ایک بات کی ان میں کسر تھی۔ پیمایش کا کام یہ بالکل نہ جانتے تھے۔ نہیں تو اسی زمانے میں ان کو بہت اچھی نوکری مل گئی ہوتی۔ اب انھوں نے پیمایش کے سیکھنے کا تہیہ کر لیا۔

منشی نبی بخش کے آنے کے بعد انھیں پھر ٹریسری کے کام پر جانا پڑا۔ دو مہینے کے بعد اب اس کام کی ضرورت دفتر میں نہ رہی تھی۔ سب ٹریسر ایک دم سے تخفیف میں آگئے۔ یہ بھی موقوف ہو گئے۔ مگر مہینے بھر منشی نبی بخش کی عوضی کرنے کی وجہ سے صاحب نے ان کو بہت عمدہ سارٹیفکٹ دیا۔ اب مرزا عابد حسین پھر وہی پانچ روپئے کے نوکر رہ گئے۔ اب نو بجے سے ان کو فرصت ہو جاتی تھی۔ اس زمانے میں انھوں نے سرویئنگ کا کام سیکھا۔ منشی نبی بخش کے ایک دوست منشی الٰہ بخش صدر میں سب اوورسیر ہو کر آئے تھے۔ ان کو اکثر پیمایش کا کام رہتا ہے ان کے پاس جانے لگے۔ انھوں نے پرزمیٹک اور لیول کی پیمایش انھیں اچھی طرح سکھا دی۔

ایک دن کا واقعہ سنیے۔ ان کے محلے میں ایک صاحب میر کاظم علی نامی رہتے تھے۔ وہ پنجاب یونیورسٹی میں مولوی، عالم کا امتحان دینے والے تھے۔ ان کے پاس یونیورسٹی کا کلنڈر رہے کے آئے اور ضوابط امتحان کے قواعد ان سے پڑھوا کے ترجمہ کرائے۔ جاتے وقت بھولے سے کلنڈر چھوڑ کے چلے گئے۔ یہ ان کے جانے کے بعد اسے الٹ پلٹ کے دیکھنے لگے۔ خوش نصیبی سے ان کی نظر

اس جزو کتاب پر جا پڑی جس میں صیغۂ انجینیرنگ کے امتحانوں کا ذکر تھا۔ یہ اسے بڑے شوق سے پڑھنے لگے۔ تھوڑا سا ہی پڑھا تھا کہ مارے خوشی کے اچھل پڑے۔ اس زمانے میں ان کے ایک دلی دوست سید جعفر حسین صاحب رڑکی کالج کے ایک پاس شدہ لائق طالب علم ملازم محکمۂ نہر رخصت پر آئے ہوئے تھے۔ مرزا عابد حسین نے فوراً کپڑے پہنے۔ کلنڈر لیے ہوئے شاہ گنج ان کے پاس پہنچے۔ سید صاحب کو آواز دی وہ گھر سے نکلے۔

سید صاحب :- خیریت تو ہے ؟

مرزا صاحب :- خیریت ہے۔ ذرا اسے دیکھیے گا۔ میرے تو حواس ٹھیک نہیں۔

سید صاحب :- (کلنڈر کو بڑے غور سے پڑھنے لگے۔ اب ان کے چہرے سے آثار مسرت کے ظاہر ہوئے) واقعی آپ امتحان دے سکتے ہیں۔

مرزا صاحب :- ذرا دیکھیے سن کی تو قید نہیں ہے۔ ؟

سید صاحب :- نہیں۔ سن کی تو قید نہیں ہے۔

مرزا صاحب :- اچھا تو اب دیکھیے مجھ کو کس کس چیز میں زیادہ محنت کرنا ہوگی۔

سید صاحب :- ریاضی، تحریر اقلیدس، مساحت یہ سب آپ جانتے ہیں انگریزی کی صرف انجینیرنگ کی اصطلاحات کی دو کتابیں جو رڑکی کالج میں چھپی ہیں انھیں دیکھ لیجیے۔ سروینگ، ڈرائنگ میرے نزدیک جتنا آپ نے سیکھا ہے کافی ہے۔ صرف ایک چیز سے آپ بالکل نابلد ہیں۔ انجینیرنگ، اس کی کتابیں میرے پاس موجود ہیں انھیں پڑھیے اور جہاں سمجھ میں نہ آئے میں اچھی طرح سمجھا دوں گا۔

مرزا صاحب :- امتحان کب ہوگا ؟

سید صاحب :- (کلنڈر دیکھ کے) مئی میں۔ ابھی دن بہت ہیں۔ یا اگست

کا مہینہ ہے۔ نو مہینے آپ کے لیے کافی ہیں۔ بسم اللہ کر کے محنت شروع کر دیجیے مگر سنیے تو آپ نے انٹرنس کہاں پاس کیا تھا؟

مرزا صاحب:۔ (ایک ذرا مشوش ہو کر) کلکتہ کا۔

سید صاحب:۔ (پھر کلنڈر دیکھ کے) سنڈیکیٹ کی خاص اجازت اور مہربانی سے ہر یونیورسٹی کا پاس شدہ لیا جاتا ہے۔

مرزا صاحب:۔ (خوش ہو کے) تو اب سنڈیکیٹ کی اجازت کیونکر حاصل ہو؟

سید صاحب:۔ میں سمجھتا ہوں یہ ایک معمولی بات ہے۔ اچھا بہتر ہے۔ رجسٹرار کو ایک درخواست دے دیجیے۔

اسی وقت درخواست کا مسودہ لکھا گیا۔ سید جعفر حسین نے انجینیرنگ کی کتابیں لا کے حوالے کیں۔ مرزا عابد حسین صاحب گھر آئے۔ فوراً درخواست کا مسودہ صاف کیا۔ لفافے میں بند کر کے ڈاک میں چھوڑ آئے۔ اس کے بعد احتیاطاً کلنڈر کی وہ تمام عبارت نقل کر کے رکھ لی جو صیغۂ انجینیرنگ سے متعلق تھی۔ اور اسی دن سے انجینیرنگ کا مطالعہ شروع کیا۔

انجینیرنگ کے پڑھنے میں ان کو ایک تو سید جعفر حسین سے دوسرے بلدیو کے کارخانے سے بہت مدد ملی۔ سامان عمارت اور فن تعمیر سے تو سید صاحب نے ان کو اکثر عمارتوں میں لے جا کے خوب واقف کرایا۔ فن نجاری اور آہنگری کے متعلق جو باتیں تھیں وہ کارخانے میں آنکھ سے دیکھیں۔

ہم ان کی سوانح عمری میں صرف اتنا لکھنا بھول گئے ہیں کہ بلدیو کے کارخانے سے جو ان کو خاص دلچسپی تھی اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ انھوں نے وہاں جانے کے تھوڑے ہی دنوں بعد لوہے کا کام سیکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ ایک دن ان کی بیوی کے پاندان کے سروتے کی کیل ٹوٹ گئی۔ دوسرے دن

جو یہ مادھو کو پڑھانے گئے ہلاس لوہار کو سرد تا دیا کہ اس میں ذرا کیل ڈال دینا۔ اس نے رکھ لیا۔ جب پڑھا کے چلنے لگے تو اس کے پاس گئے۔ وہ کسی کام میں لگا ہوا تھا۔ بھول گیا۔ ان کو گھر جانے کی جلدی تھی۔ ایک کیل وہاں پڑی ہوئی تھی اسے اٹھا کے اپنے ہاتھ سے کیل ڈالنا چاہا۔ کیل ڈال کے ہتوڑے سے سر کو چپٹا کرنے لگے۔ ہتھوڑی انگلی پر پڑ گئی۔ انگلی پچی ہو گئی۔ ہلاس نے جو یہ دیکھا، ہنسنے لگا۔ ان کے ہاتھ سے سرد تالے کے کیل ڈال دی۔ ایک تو ان کے چوٹ لگی۔ دوسرے کام نہ ہوسکا۔ تیسرے خفت ہوئی۔ خود فرماتے تھے کہ ہلاس کا یہ کہنا میاں صاحب یہ پڑھنا نہ ہو۔ لوہے کا کام ہے آپ لوگوں سے نہیں ہوسکتا اس وقت میرے دل پر اثر کر گیا۔ میں نے دل میں ارادہ کر لیا تھا۔ خدا چاہے تو اس کام کو سیکھ کے چھوڑوں۔ دو تین دن میں چپکا ہو رہا پھر اسی ہلاس کے پاس بیٹھنا شروع کیا۔ پہلے تو وہ کچھ دن ہنس کے ٹال دیا کرتا تھا۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ پیچھا نہیں چھوڑتے تو آخر بتانے لگا۔ چند ہی روز بعد میں نے اپنے گھر پر بھٹی بنائی۔ ایک دھونکنی مول لی۔ نخاس سے بہت سے اوزار خریدے۔ ریل کے دفتر سے میں چلا آتا تھا۔ ایک انگریز کے بنگلے پر نیلام ہو رہا تھا۔ بہت سے آدمی جمع تھے۔ میں نے اسی دن تنخواہ پائی تھی۔ میں بھی چلا گیا۔ یہاں سے ایک بکس کاٹ کباڑ کا خرید لیا۔ اس میں بہت سی ضروری چیزیں تھیں۔ بڑھئی کے اوزار پورے تھے کچھ لوہاری کے اوزار تھے۔ ایک فیتہ تانبے کا تھا۔ یہ بکس سوا دو روپئے پر میرے نام پر چھوٹ گیا۔ پھر ایک سینے کی کل پر بولی ہوئی۔ یہ تین روپئے کو مل گئی۔ ایک برف بنانے کی کل تھی۔ اس کا ایک پرزہ ٹوٹا ہوا تھا۔ ڈیڑھ روپئے کو دے لی۔ گھر پر لا کے برف بنانے کی کل میں نے کھول ڈالی۔ ٹوٹے پہیے کو نکال کے ویسا ہی ایک پرزہ ڈھالنے کا سامان کیا۔ ڈھالنے کا

مسالہ تیار کیا۔ پکی اینٹوں کی سرخی، چینی کے ٹکڑے، یہ سب چیزیں مناسب مقدار
سے لے کے کوٹ پیٹ کر ایک سفوف بنا لیا۔ اس میں تھوڑا تارپین کا تیل ملا
لیا۔ پھر ایک سانچہ لوہے کا اپنے ہاتھ سے بنا لیا۔ پھر اسی ٹوٹے پرزے میں جو دندانہ
ٹوٹ گیا تھا۔ ویسا مٹی کا بنا کے سکھا لیا۔ مسالہ کو سانچے میں ڈال کے داغ بنا لیا اور
تھوڑا تیل ملا کے ویسا ہی پرزہ ڈھال لیا۔ پھر سوہن سے صاف کر کے کل میں جڑ
دیا۔ وہ کل ابھی خاصی چلنے لگی۔ پھر پرزوں کو کھول کے سیاہ تاب کیا۔ بالنی
کا وارنش اڑ گیا تھا۔ اسے درست کیا۔ غرض کہ کل بالکل نئی ہو گئی۔ میاں
حسین علی کے حوالے کی۔ انھوں نے تماس میں دکھائی۔ دس روپے کو فروخت
ہوئی۔ پھر سینے کی کل کے جو پرزے ٹوٹے ہوئے تھے انھیں بھی اپنے ہاتھ
سے درست کر دیا۔ بیوی اس کل سے بہت خوش ہوئیں۔ میاں حسین علی کی
بیوی محلہ بھر سے کام لے آتی تھیں۔ بیوی سیا کرتی تھیں۔ اس کام میں چکن
کی ٹوپیوں سے زیادہ یافت تھی۔

اس کے بعد لکڑی کے کام پر مشق کرنا شروع کی۔ چند ہی دنوں میں
گھڑونچیاں، تپائیاں، الماریاں، چوکیاں، تخت بنا بنا کے بیچنا شروع کیے۔
ریل کے دفتر سے جب نوکری چھوٹی تو اس سے روٹیاں چلتی رہیں۔ جو کچھ
پس انداز ہوا اس میں ہاتھ نہیں لگایا۔ خدا نے ان کاموں میں ایسی برکت
دی کہ انجینئری کا امتحان پاس کرنے سے پہلے ہی درگاہ والا مکان چھڑوا لیا۔
مگر وہاں سکونت نہیں اختیار کی۔ جس کنجڑے کے پاس رہن تھا اسی کو کرائے
پر دے دیا۔ جس مکان میں اب سکونت تھی اسے مول لے لیا۔ برتن باسن
خریدے۔ بیوی کے ہاتھ گلے میں کچھ زیور بھی ہو گیا۔ بیوی کے نذر میں مرزا
عابد حسین کی کمائی کا ایک حبہ بھی صرف نہیں ہوا۔ وہ سب انھوں نے

سلائی کر کے بنوایا تھا۔

عابد حسین جس قدر محنت کرتے جاتے تھے اسی قدر محنت کی عادت بڑھتی جاتی تھی اور اس سے جو کامیابی ہوتی تھی اس سے شوق زیادہ ہوتا جاتا تھا۔ اسی محنت کا یہ نتیجہ تھا کہ پنجاب یونیورسٹی کے امتحان انجینئرنگ میں اول درجہ کی سند عطا ہوئی۔ اب کیا تھا گویا سرکاری ملازمت کی دستاویز ہاتھ آگئی۔ دو ہی تین مہینے کے بعد نوکر ہو گئے۔ ساٹھ روپیہ تنخواہ۔ پندرہ روپیہ بھتہ۔ پچھتر روپیہ ماہوار کی آمدنی ہوئی۔ محکمۂ تعمیرات میں ناجائز آمدنی کی بہت گنجایش ہے۔ مگر ہم اپنے ناظرین کو یقین دلاتے ہیں کہ ہمارے دوست نے کبھی ایک حبہ سوائے تنخواہ کے نہیں لیا۔ شاید آپ کو یہ خیال ہوگا کہ مرزا صاحب نے ریلوے کے دفتر میں نوکر ہو جانے کے بعد بلدیہ کی نوکری چھوڑ دی ہوگی۔ نہیں چھوڑی۔ اور پھر گھر پر بھی کام کرتے تھے۔ بیوی علیٰحدہ کام کرتی تھیں جس سے یہ وہم ہوسکتا ہے کہ ان میاں بیوی کو ضرورت سے زیادہ روپیہ پیدا کرنے کی ہوس تھی مگر اس کے ساتھ ہی ناجائز طریقے سے روپیہ پیدا کرنا ان کا شعار نہ تھا۔ انھوں نے جو کچھ پیدا کیا وہ اپنے قوتِ بازو سے پیدا کیا۔ اس سے ان کو سرکاری ملازمت میں رشوت خور اہلِ عملہ کی وجہ سے بعض موقعوں پر دشواریاں ہوئیں۔ جس کا ذکر آئندہ کیا جائے گا۔ پہلے ہم اُن کے اُن اوصاف کا شمہ ذکر کرتے ہیں جن سے ان کے افسر، ان کی قدر دانی کرنے لگے تھے جو اُن کی یوماً فیوماً ترقی کا باعث ہوا۔ ایک مرتبہ ان کے افسرِ اعلیٰ اکزیکٹیو انجینئر صاحب نے ایک منحرف پُل کی محراب کے قالب کا اسکیم بنا کے دیا اور حکم دیا کہ فوراً بڑھئی خانے سے ایک ایسا قالب بنوا دو پرسوں ہم دورے پر جانے والے ہیں اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ پورے قد کا

نقشہ تیار نہ تھا۔ اس لیے بڑھئی مستری کی سمجھ میں نہ آیا۔ اب اگر نقشہ تیار کیا جاتا ہے تو دیر ہوتی ہے۔ آخر انھوں نے قالب اپنے ہاتھ سے خود بنانا شروع کیا۔ آدھا بنا ہوگا کہ صاحب کارخانے میں معائنے کو آئے۔ دیکھا اوورسیر صاحب خود ہاتھ میں بسولا لیے کام کر رہے ہیں۔ بڑھئی مستری صاحب ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں صاحب نے اسی حال میں ان کو آکے دیکھا۔ بہت ہی خوش ہوئے۔ اس دن سے صاحب کو معلوم ہوا کہ یہ اپنے ہاتھ سے کام کر سکتے ہیں۔ اسی طرح لوہے کا کام بھی اپنے ہاتھ سے کرتے ان کو دیکھ لیا۔ جب صاحب کی تبدیلی ہوئی تو ان کی سروس بک پر لکھا: "عابد حسین اپنا کام خوب جانتا ہے اور بڑھئی اور لوہار کے کام اپنے ہاتھ سے کر سکتا ہے۔ ہم اس کی ترقی کی سفارش کرتے ہیں" اس کی سفارش کا یہ نتیجہ تھا کہ اپنی ملازمت کے دو ہی سال کے اندر سب انجینیر ہو گئے۔

ایک مرتبہ ان کو قومی شجاعت دکھانے کا بھی موقع ملا۔ بات یہ ہوئی کہ سرحد افغانستان میں کچھ دنوں کے لیے ان کی تبدیلی ہوگئی تھی۔ ایک دن انجینیر صاحب کے ساتھ یہ ایک پہاڑ کے درّے میں پیمائش کو گئے تھے۔ وہاں دفعتاً چھ سات پٹھانوں نے آکر گھیر لیا۔ خلاصی یہ معاملہ دیکھ کر رفوچکر ہو گئے۔ یہ اور صاحب اکیلے رہ گئے۔ صاحب نے کمر سے ریوالور نکالا۔ اتفاق سے گولی نہ چلی۔ اس پر افغانی اور دلیر ہو گئے۔ انھوں نے سینہ سپر ہو کر صاحب کی جان بچائی اور تلوار میان سے کھینچ کر بڑی مردانگی سے مقابلہ کیا۔ ان کے والد مرحوم اکثر فنون سپاہ گری میں مشاق تھے۔ انھوں نے لڑکپن میں کچھ اُن کو بھی سکھا دیا تھا۔ وہی اس دن ان کے کام آیا اور اسی دن ان کو قدیم فنون سپہ گری کی قدر ہوئی۔

اس واقعے سے صاحب کے دل میں ان کی جگہ ہو گئی۔ سب ماتحتوں سے زیادہ ان کو مانتے تھے۔ چنانچہ ان کے سارٹیفکٹ میں بھی جو انھوں نے ولایت جاتے وقت ان کو بطور خود دیا تھا۔ اس میں اس واقعہ کا اشارہ کیا ہے۔

جس زمانے میں مرزا عابد حسین نہر کے محکمہ میں ملازم تھے، ایک رشوت خور ہیڈ کلرک سے عداوت ہو گئی۔ وجہ عداوت یہ تھی کہ درگا ٹھیکیدار جس کے معرفت راجباہوں کی پلوں کی مرمت ہو رہی تھی، دس روپیہ سیکڑہ اوورسیر صاحب کو دیتا تھا جس کی جگہ پر مرزا صاحب تشریف لے گئے تھے۔ اس میں اوورسیر اور ہیڈ کلرک میں نصفا نصفی کا حساب ہو جایا کرتا تھا۔ مرزا صاحب بھلا اس کو کب جائز رکھتے ہیں۔ انھوں نے ماہواری حساب پیمائش میں ایک انچ کی کسر نہ رکھی۔ ٹھیکیدار کی نانی مر گئی۔ اس صورت میں بھلا وہ کچھ کیوں دیتا مگر ہیڈ کلرک صاحب کو سخت نقصان ہوا۔ پہلے انھوں نے اشارتاً و کنایتاً مرزا صاحب سے کہا۔ یہ ایسی کب سنتے تھے۔ پھر صراحتاً بذریعہ سکنڈ کلرک کے کہلوایا کہ ہمارے معاملات میں دست اندازی نہ کیجیے۔ اس میں آپ کا بھی نفع ہے ہمارا بھی۔ مرزا صاحب نے جواب دیا کہ کسی کا نفع کیوں نہ ہو، سرکار کا تو نقصان ہے جو ہم کو پیش بہا درماہہ دیتی ہے۔ میں اس کو گوارا نہیں کر سکتا۔ مجھ سے ایسی امید نہ رکھیں اور نہ دوبارہ اس بارے میں مجھ سے گفتگو کی جائے۔ یہ صاف جواب ہیڈ کلرک کو بہت ہی شاق ہوا۔ اب وہ صاحب کے کان ان کی طرف سے بھرنے لگا۔ کبھی کسی کام کے تاخیر ہونے کا الزام لگایا۔ کسی حساب کتاب میں کچھ شکوک پیدا کر کے صاحب کے گوش گذار کیے۔ بعض ٹھیکیداروں سے شکایت کرا دی کہ مرزا صاحب کام نہیں دیکھتے۔ صاحب کے بیرا اور خانساماں ان سے پہلے ہی موافق تھے۔ ان سے وقتاً فوقتاً

کچھ کہلواتے رہے۔ پہلے تو ان امور پر صاحب کو اعتبار نہ ہوئی مگر کہاں تک۔
کہنے سننے سے پہاڑ مل جاتے ہیں۔ آخر صاحب کو ان کی طرف سے سوءِ ظن
پیدا ہو گیا اور اس کے آثار باہمی خط و کتابت میں ظاہر ہونے لگے۔ مرزا
ایسے بیوقوف نہ تھے جو اس معاملہ کو سمجھ نہ جاتے مگر بقول شیخ "آن را کہ
حساب پاک است از محاسبہ چہ باک"۔

ایک مرتبہ پانچ میل کا لیول صاحب نے کیا تھا۔ اس کی جانچ کے
واسطے مرزا صاحب کو بھیجا۔ مرزا صاحب نے پیمائش کی۔ کام کی عجلت تھی۔
اس لیے رڈیوسڈ لیول نکالنے کے لیے فیلڈ بک دفتر میں دیدی۔ یہاں ہیڈ
کلرک صاحب نے فیلڈ بک غلط کر دی۔ جب رڈیوسڈ لیول نکال کے صاحب
کی فیلڈ بک سے ملان ہوا۔ دس فیٹ کی غلطی ہو گئی۔ یہ وہ پیمائش ہے جس میں
فی میل ۱/۲ انچ کی غلطی معاف ہے۔ یہاں دس فیٹ کی غلطی پانچ میل میں۔
صاحب نہایت ہی برہم ہوئے۔ ادھر مرزا صاحب اپنی جگہ پر نادم کہ غلطی اور اس
قدر غلطی۔ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ حالانکہ مرزا صاحب نے بڑی ہوشیاری سے پیمائش
کی تھی۔ ہر ایک گز کو دو دو مرتبہ پڑھا تھا بہت ہی متردد تھے۔ بیٹھے فیلڈ بک کے
ہر ایک خانے کو جانچ رہے تھے۔ اکثر موقعوں کے گز ان کو یاد تھے۔ فیلڈ بک میں
اس کے خلاف لکھا ہوا تھا۔ اب ان کو کچھ شک پیدا ہوا۔ میگ نی فائر (شیشۂ خورد
بین) لگا کے جو دیکھتے ہیں مٹے ہوئے پنسلی داغ صاف پڑھ لیے گئے۔ وہ ان کی یاد
کے مطابق تھے مگر اکثر جگہ میگنیفائر سے مٹے ہوئے نشان نہ پڑھے گئے۔ دوسرے
دن پھر موقع پر پیمائش کرنے گئے۔ پہلی مرتبہ لیول کرتے وقت ایک کا غذ پر دائر فال
(نشیب و فراز) کا حساب کیا تھا۔ وہ کاغذ اتفاقاً ایک جگہ سڑک کے کنارے پڑا ہوا
مل گیا۔ مرزا صاحب اسی وقت اس کاغذ کو لیے گھوڑا دوڑا کے صاحب کے بنگلے پر

پہنچے اور حقیقتِ حال بیان کی۔ صاحب ہیڈ کلرک پر بہت مہربان تھے۔ مرزا کے کہنے سے کچھ شک تو ہو گیا مگر کسی قسم کا تدارک نہ کیا۔ اس سے بہت ہی بددل ہوئے اور اس دن سے دفتر والوں سے بہت ہوشیار رہنے لگے۔ دفتر والوں کا کوئی قابو نہ چلا مگر ان کی وجہ سے ان کا مالی نقصان ہوتا تھا۔ اس لیے یہ فکر تھی کہ کسی طرح ان کو نکلوانا چاہیے۔ آخر ایک ٹھیکیدار سے رشوت دہی کا اظہار صاحب کے سامنے دلوا دیا، اور اس سلیقہ سے مقدمہ بنایا کہ صاحب کو یقین آ گیا۔ صاحب نے مرزا کو معطل کیا اور مقدمہ فوجداری میں بھیج دیا۔ تحقیقات شروع ہو گئی۔ استغاثے کی طرف کے گواہ پورے ٹھیک اتر گئے۔ مرزا کے کونسل نے بہت زور دیا۔ جرح کے سوالات بہت ہی سخت کیے مگر ایک گواہ نہ ٹوٹا۔ مرزا پر چارج قائم ہو گیا۔ اب ڈیفنس کے گواہ گذرنے لگے۔ مرزا نے یہ عذر کیا کہ جس دن اور جس وقت کا یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ میں پچاس میل کے فاصلہ پر خود انجینئر صاحب کے ساتھ پیمایش کر رہا تھا۔ انجینیر صاحب خود گواہی میں طلب ہوئے تھے مگر ہیڈ کلرک صاحب جعل سازی میں کامل تھے۔ انھوں نے پہلے ہی اس کا انتظام کر لیا تھا۔ صاحب کے دورے کی کتاب میں تاریخ بدل دی گئی۔ اگرچہ صاحب کو خود یاد تھا مگر تحریری شہادت کے مقابلہ میں زبان کیا کام دیتی۔ مرزا کا عذر نہ چل سکا۔ مرزا پر جرم عائد ہو گیا۔ جیل خانے جانے میں کوئی بات باقی نہ تھی۔ مرزا کے کونسل نے عذر مزید کے لیے مہلت مانگی۔ سشن جج نے نامنظور کی۔ اگرچہ مرزا کے چال چلن سے ایک زمانہ واقف تھا۔ خود اہل جوری مرزا کی بے گناہی کے مقر تھے مگر شہادتِ تحریری اور زبانی اس قدر ان کے خلاف تھی کہ کچھ کسی کے بنائے نہ بنتی تھی۔ کارروائی اس مقدمہ کی روزانہ اخباروں میں چھپتی تھی۔ اہلِ اخبار کی رائے بھی مرزا کے موافق تھی۔ از کہ تا مہ سب کو مرزا کی بے گناہی پر

افسوس تھا۔ درحقیقت مرزا پر یہ بہت ہی سخت وقت تھا۔ خاص مرزا کے دل پر جو کچھ گذر گیا اس کو سوائے خدا کے اور کوئی نہیں جانتا۔ بیوی بچوں میں قیامت برپا تھی۔ مقدمے کی آخری پیشی میں کوئی چار دن اور باقی تھے۔ ہیڈ کلرک اور ان کے ماتحت بعض اہلِ دفتر جو رشوت خوری میں ان کے کاسہ لیس تھے بہت ہی خوش تھے۔ صاحب کو مرزا کے ساتھ کوئی ہمدردی نہ تھی۔ ایک تو یہ اس سبب سے کہ ہیڈ کلرک نے ان کو مرزا کی طرف سے پہلے ہی بدظن کر رکھا تھا۔ دوسرے ایک سبب یہ بھی تھا کہ صاحب بہادر کسی قدر بدزبان تھے اور مرزا کو اس کی برداشت نہ تھی۔ ایک دن دورے پر مرزا سے اور ان سے ایک واقعہ پر تکرار ہو چکی تھی۔ واقعہ یہ تھا۔

صاحب بہادر لیول کر رہے تھے۔ مرزا پیسنگ (قدموں سے پیمائش کرنا) کر کے کھونٹیوں پر گز رکھواتے جاتے تھے۔ خلاصی جو گز لیے ہوئے تھا پیمائش کے کام سے واقف نہ تھا۔ اس نے ایک گز کو بجائے کھونٹی کے زمین پر پڑھوا دیا۔ صاحب اس گز کو پڑھ کے آگے بڑھے۔ مرزا کو جب اس غلطی کی اطلاع ہوئی تو بہ خیال اس کے کہ پیمائش غلط نہ ہو جائے صاحب سے کہہ دیا۔ اب صاحب کو دوبارہ لیول کر کے گز پڑھنا پڑا۔ اس بات پر صاحب بہت جھنجھلائے اور بجائے اس کے کہ مرزا سے خوش ہوتے سخت کلمہ کہہ بیٹھے۔ مرزا کو بہت ہی ناگوار ہوا مگر چونکہ اس باب میں تھوڑی سی غفلت مرزا کی بھی تھی اسلیے خاموش ہو رہے۔ اس پیمائش میں تھوڑی دور اور آگے جا کے صاحب نے حکم دیا کہ گاؤں کے سرحد پر گز رکھواؤ۔ مرزا اس علاقہ میں چند ہی روز سے آئے ہوئے تھے اور کبھی اس طرف دورے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ اس لیے لوگوں سے سرحد دریافت کرنے لگے۔ اس میں دیر لگی۔ اب شام کا وقت تھا صاحب

کو ڈیرے پر پہنچنے کی بہت جلدی تھی۔ چاہتے تھے پیمائش جلد ختم کریں۔ اس لیے بہت ہی جھنجلائے ہوئے تھے۔ چھوٹتے ہی مرزا کو اُلّو کہہ بیٹھے۔ اس وقت مرزا سے بھی یہ گستاخی ہوئی کہ انھوں نے صاف جواب ترکی بہ ترکی دیا۔ صاحب اس کے عادی نہ تھے اس لیے سخت ناگوار ہوا۔ قریب تھا کہ نوبت بہ ہشت مُشت پہنچتی۔ مگر چپراسیوں نے بیچ بچاؤ کر دیا۔ سہ معاملہ مل گیا تھا۔ پیمائش ختم ہوئی۔ گاڑی صاحب کی پہنچ گئی تھی۔ سوار ہوئے۔ اب بالکل رات ہو گئی تھی۔ ڈیرہ اس مقام سے آٹھ میل کے فاصلے پر تھا۔ مرزا کو معلوم نہ تھا کہ صاحب کہاں تک پیمائش کرتے چلے جائیں گے۔ گھوڑے کا حکم نہ دیا تھا۔ صاحب بہادر خود گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوگئے۔ مرزا پاپیادہ ہمراہ ہوئے صاحب کا غصہ اب فرو ہو گیا تھا۔ باتیں ہونے لگیں۔ بڑی دور تک مرزا پاپیادہ گاڑی کے ساتھ چلے گئے۔ صاحب کا اردلی اور چپراسی دونوں گاڑی پر تھے آخر صاحب گاڑی تیز کر کے آگے بڑھ گئے۔ مرزا بیچارے کوئی نو بجے رات کو سردی کھاتے ہوئے اپنے ڈیرے پر پہنچے۔ غرضکہ صاحب بہادر سے اور مرزا سے ناچاقی ہو گئی تھی۔ اگرچہ یہ امر کچھ ایسا نہ تھا لیکن اس جرم پر صاحب نے بہت بند کر دیا تھا۔ مرزا نے اس کی کوئی شکایت افسرِ اعلیٰ سے نہ کی۔ اِس واقعہ کی خبر چھپی رہنے والی نہ تھی۔ ہیڈ کلرک صاحب کو حاشیہ لگانے کا خوب موقع ملا۔ مرزا نے بہت چاہا کہ اپنی کارگزاریوں سے صاحب کو خوش کریں۔ مگر صاحب کے دل میں ان کی طرف سے گنجائش ہی نہ تھی۔ جو کام سے قابلِ تحسین تصور کرتے تھے صاحب اس کو ان کا فرضِ منصبی تصور کرتے تھے اور اگر بہ تقاضائے بشریت کسی قسم کی فروگذاشت ہو جاتی تھی تو صاحب کو اس کی یادداشت کی فکر ہوتی تھی۔ مقدمۂ فوجداری میں صاحب نے اگرچہ قانونی کارروائی کی اور صاحب

سے کوئی امر خلاف صدق نہیں ہوا۔ اس میں صاحب کا کیا گناہ تھا کہ ان کی نوٹ بک غلط کر دی گئی۔ جو لوگ ان معاملات سے واقف تھے ان کی یہ رائے تھی کہ صاحب کو مرزا کے ساتھ کچھ رعایت کرنا تھی۔ اگرچہ صاحب کو مثل ہیڈ کلرک کے اس کی خوشی نہ تھی کہ مرزا قید ہو جائیں۔ مگر مرزا کے قید ہو جانے پر صاحب کو کچھ افسوس بھی نہ تھا۔ افسر اور ماتحت میں ضرور ہے کہ کسی قدر ہمدردی ہو۔ محض قانونی تعلق سے کام نہیں چل سکتا۔ یہ ہمدردی دو طرح سے پیدا ہو سکتی ہے۔ ایک تو جائز طریقے سے۔ وہ یہ کہ ماتحت کارگذار ہو اور افسر قدر شناس۔ اور دوسرے بطور ناجائز۔ وہ یہ کہ ماتحت خوشامدی ہو اور افسر خوشامد پسند۔ نہ صاحب خوشامد پسند تھے نہ مرزا خوشامدی۔ مرزا کارگذار ماتحت تھے اور صاحب قدر شناس مشہور تھے۔ مگر ہیڈ کلرک صاحب نے واقعات پر ایسا پردہ ڈال دیا تھا کہ مرزا کو اپنی کارگذاری دکھانے اور صاحب کو قدر شناسی کرنے کا موقع نہ دیا۔ مرزا کو اس کی بھی پروا نہ تھی۔ اس لیے کہ یہ اکھڑ آدمی تھے۔ یہ صرف اپنا کارِ منصبی کر کے خوش ہوتے تھے کارِ منصبی کا عوض اپنی تنخواہ کو سمجھتے تھے۔ اس کے لیے کسی قسم کے صلے یا ستائش کو ضعفِ طبیعت خیال کرتے تھے۔ ان کی ششماہی کارگذاری کی رپورٹوں میں ان کے گذشتہ افسروں نے سطریں کی سطریں تعریف میں لکھی تھیں سوائے اس ششماہی کے جس میں برا بھلا کچھ نہ لکھا گیا تھا اور اس کے بعد بجٹ بند کر دیا گیا تھا۔

معاملات کی یہ صورت تھی۔ جب مقدمہ قائم ہوا۔ اب صرف چار دن اور باقی ہیں۔ ہر شخص جس کو ان سے تعلق خاطر تھا، اسی افسوس میں تھا کہ مرزا مفت پھنسے

مرزا بے چارے خاموش ہیں کہ شکوہ نہ شکایت تقدیر پر شاکر ہیں ؎

ناکامی امید بھی ہے رحم کے قابل مایوس ہیں ایسے کہ دعا بھی نہیں کرتے

مرزا کا بیان ہے کہ میں نے اس باب میں خدا سے کسی قسم کی دعا نہیں لی۔ میرا خیال تھا کہ میرا عقیدہ ہے کہ خدا مجھ پر میرے ماں باپ سے زیادہ مہربان ہے۔ وہ دانائے راز اور کارساز ہے۔ اس حالت میں جو میرے حق میں مناسب ہوگا وہی کیا جائے گا۔ مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔ اس خیال سے دعا کچھ ضروری نہیں۔ رہی یہ بات کہ دعا سے شانِ عبودیت ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے واسطے دعائے قنوت اور دیگر ادعیہ جو نماز میں داخل ہیں کافی ہیں۔ ہماری رائے اس امر میں مرزا کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ سوائے اظہارِ عبودیت کے ایک قسم کا خلوص بھی دعا سے پایا جاتا ہے۔ خیر اس موقع پر اس مسئلہ پر زیادہ بحث کرنا ہم کو منظور نہیں۔ مرزا کی سیرت کا بیان من و عن مطلوب ہے۔

مرزا کی قسمت کے فیصلے میں تین دن باقی ہیں۔ شیو بہاری ٹھیکیدار اصل مستغیث اور رام دین ایک اور ٹھیکیدار دونوں شراب خانے میں بیٹھے ٹھرا اڑا رہے ہیں اور یہ باتیں ہو رہی ہیں۔

رام دین :۔ کہو اس مقدمہ میں کیا ہوا؟

شیو بہاری :۔ کون مقدمہ؟ مرزا والا؟

رام دین :۔ وہی مقدمہ۔

شیو بہاری :۔ مرزا اب نہیں بچتے۔ گئے چھ سات برس کو۔

رام دین :۔ بڑے پُن کا کام کیا تم نے۔

شیو بہاری :۔ کیوں پُن کا کام کیوں نہیں کیا۔ ایسے کا جانا ہی اچھا ہے۔ آپ کھائے نہ دوسروں کو کھانے دے۔ باپ قسم، بھیا رام دین۔ جب سے یہ مرزا اس علاقے میں آیا، میرا تو دس بارہ ہزار کا نقصان ہو گیا۔

رام دین :۔ کیوں، کیا تمہارا کوئی بل کاٹ دیا ؟

شیو بہاری :۔ بل تو نہیں کاٹ دیا مگر بالو کی صفائی میں ہم کو ہزار ڈیڑھ ہزار سال میں مل جایا کرتے تھے۔ چار برس سے ایک کوڑی بھی نہیں ملی۔

رام دین :۔ کیوں، کیا ٹھیکہ توڑ دیا ؟

شیو بہاری :۔ نہیں ٹھیکہ تو نہیں توڑا۔ پیمایش میں کوئی گنجایش نہیں رکھی۔ دو سو پچیس سات آنہ وصول ہے۔ کہو جب اس کام میں دو سو پچھتر سال میں ملے تو ہم کیا کھائیں گے ؟

رام دین :۔ تو پیمایش میں کم ناپا ہوگا ؟

شیو بہاری :۔ تم تو سمجھتے ہو پھر نادان بنتے ہو۔ کون کہتا ہے کہ کم ناپا۔

رام دین :۔ پھر ان کی کیا خطا۔ جتنا کام تم نے کیا تھا۔ اس کے دام دلوا دیے۔ ایک ہم کہیں گے کہ مرزا صاحب پیمایش کے بڑے سچے ہیں۔ ہم نے تو ایک بل بنوایا تھا۔ اس میں دیکھ لیا۔ ہمارا جتنا کام تھا اس سے ایک انچ نہ گھٹایا نہ بڑھایا۔ نہ ہمارا نقصان کیا نہ سرکار کا۔ پورے دام دلوا دیے۔ ہیڈ کلارک صاحب پانچ روپیہ مانگتے تھے۔ میں نے اپنا پورا بل آنہ پائی سے وصول کر لیا کوڑی نہیں دی۔ دیتا کیوں ؟ کام میں نے کیا۔ محنت کی روپیہ لگایا۔ پھر ہیڈ کلارک کون ہوتے ہیں جو روپیہ لیتے۔

شیو بہاری :۔ کتنے کا بل تھا ؟

رام دین :۔ پانچ ہزار چھ سو اکانوے روپیہ تیرہ آنہ سات پائی کا۔

شیو بہاری :۔ اور اوورسیر صاحب کو کیا دیا ؟

رام دین :۔ مرزا کو ؟

شیو بہاری :۔ ہاں۔ اور کسے ؟

رام دین :- اتنی تو میں قسم کھا سکتا ہوں کہ مرزا نے کبھی ایک پیسہ گھوس کا نہیں کھایا۔ تم نے اس غریب کو بے کار پھنسایا ہے۔ دیکھنا کیا بھگتان بھگتتے ہو۔ اور پھر جھوٹی گنگا عدالت میں اٹھائی۔ مرزا دیوتا آدمی ہے۔ اس کو ستا کے چین نہ پاؤ گے۔ اتنا کہہ کے رام دین نشہ کی دھن میں زار وقطار رونے لگا۔

شیو بہاری :- مرزا تو اب جاتے ہیں۔ تم رویا کرو۔ جو ہمارا نقصان کرے اس کے باپ کو ہم پھنسائیں گے۔

رام دین :- ابے جا۔ تو نے دھرم ناس کیا۔ ایسے گئو آدمی کو پھنسایا۔ پرمیشر چاہے گا تو اس کا عوض اسی جنم میں مل جائے گا اور دوسرے جنم میں جو بھگتان بھگتنا پڑے گا اسے کون جانے۔

شیو بہاری :- اور جو دوسرے کا پیٹ کاٹے اس کا کیا حال ہوگا؟

رام دین :- کون سا تیرا پیٹ کاٹا۔ جتنا تو نے کام کیا تھا اس کا روپیہ دلوا دیا۔

شیو بہاری :- اور آپ جو رشوت کھائی؟

رام دین :- تو جھوٹا ہے۔ مرزا نے ایک دمڑی رشوت نہیں کھائی۔ ۷ مئی کو جس دن تو نے بیان کیا ہے کہ رشوت دی ہے اس دن مرزا صاحب کے ساتھ دورے پر تھے۔ تو بیان کرتا ہے کہ بُرہام پور کے پڑاؤ پر پانسو روپیہ سات بجے رات کو لے گئے۔

شیو بہاری :- تو کیا اس میں جھوٹ ہے؟

رام دین :- سب جھوٹ ہے۔ اس دن چار بجے صاحب نے سیتا نالے کا پل دیکھا مرزا صاحب کے ساتھ تھے۔ وہیں میں بھی تھا۔ میری مدت گئی تھی۔ میرے چٹھے میں صاحب کا ملاحظہ لکھا ہوا ہے۔ وہاں سے چار میل کے آگے

صاحب نے شیودین کھیڑہ میں قیام کیا۔ دوسرے دن صبح سے شام تک صاحب کے ساتھ پیمایش میں رہے۔ شیودین کھیڑے سے بہرام پور ۲۴ میل کے فاصلے پر تجھ سے رشوت لینے کس وقت گئے تھے۔ ؟

شیو بہاری :۔ ۷ رمئی کو صاحب دورے پر گئے ہی نہیں۔ ان کی نوٹ بک میں ۷ ار تاریخ کا دورہ لکھا ہے تو ۷ رمئی کا دورہ بک رہا ہے۔

رام دین :۔ سات کے سترہ دفتر میں بنے ہیں۔ ہمارا پچھا تو کوئی دیکھے۔

شیو بہاری :۔ ابے تیرا پچھا کون پوچھتا ہے۔ صاحب کی نوٹ بک صحیح ہے کہ تیرا پچھا صحیح ہے ؟

رام دین :۔ صاحب کی نوٹ بک میں تو جعل بنا ہے۔ ہمارے پچھے میں کون جعل بناتا ؟

شیو بہاری :۔ پھر تو نے گواہی دی ہوتی ؟

رام دین :۔ ہم گئے ہوئے تھے کانپور۔ نہیں تو گواہی ضرور دیتے۔ اور اب جو موقع ہوگا تو کیا گواہی نہ دیں گے ؟

اس تقریر کو سن کر شیو بہاری ذرا دھیرے ہوئے۔ نشہ ہرن ہونے لگا۔ کیونکہ ابھی مقدمہ کی تاریخ کے تین دن باقی تھے۔ مدعا علیہ کو مزید عذر کی گنجایش باقی تھی۔

اِدھر تو دونوں ٹھیکیداروں میں یہ باتیں ہو رہی تھیں اُدھر ٹکھئی چمار جو مرزا کے سائیس کا بھائی تھا۔ ٹکے کا ٹھرا اڑانے بھٹی خانے میں آیا کرتا تھا اس نے جو اس مقدمہ کی باتیں سنیں۔ ٹھرا پی کے نیم کے درخت کی آڑ میں چلم پینے لگا۔ مقدمہ کی روداد سے اسکو بھی ایک گونہ تعلق تھا۔ اس دن خوامخواہ ٹکے کا ٹھرا پیا اور جیبا بیٹھا سنا کیا۔

گھر پر پہنچتے ہی اپنے بھائی متّا سے کل واقعہ بیان کیا۔ متّا نے دوسرے دن صبح کو مرزا صاحب سے یہ سب حال کہا۔ چلیے رام دین مع چھٹے کے طلب ہو گئے۔ یہی شہادت مرزا کی بریت کے لیے کافی تھی لیکن ایک امر خداساز واقع ہوا۔ شیو بہاری اور رام دین کی تقریر اگرچہ چنداں دلچسپ نہ تھی۔ مگر مرزا صاحب کے ایک دوست نے اس کو نکھٹی سے دوبارہ سنا اور اسے قلم بند کر کے رام دین کے آگے دہرادی اور انگریزی میں ترجمہ کر کے اخبار میں بھیجدی۔ یہ اخبار صاحب سپرنٹنڈنٹ انجینیر کی نظر سے بھی گذرتا تھا۔ انھوں نے جو اس کو پڑھا اسی وقت اپنی فائل سے ایک ڈیمی آفیشل چھٹی صاحب ایگزیکٹو انجینیر کی نکال کے دیکھی۔ اس میں سیتا نالے کے ملاحظہ کا کچھ ذکر تھا۔ اس میں فی الواقع ۷ رمئی از مقام شیو دین کھیڑہ تحریر تھا۔ صاحب موصوف نے اسی وقت ایک چھٹی ایگزیکٹیو انجینیر کو اور ایک صاحب سشن جج کو تحریر کی۔ اب مقدمہ کی صورت بدل گئی۔ مرزا نہایت عزت کے ساتھ بری ہوئے۔ شیو بہاری پر الٹا مقدمہ چلا۔ بچا سات برس کو گئے۔ ہیڈ کلرک پھنس ہی گئے مگر ہونے مگر جعل بنانا ثابت نہ ہو سکا۔ اس علاقہ سے تبدیل کر دیے گئے مرزا وہیں رہے۔ چند ہی روز بعد صاحب کی بھی تبدیلی ہوئی۔ دوسرے صاحب جو آئے ان سے مرزا سے خوب موافقت رہی اور سپروائزر کے عہدے تک ترقی ہوئی۔

احباب

ایک حکیم کا قول ہے کہ انسان کے ذہن کی ترقی کے دو سبب ہیں ایک

داخلی اور دوسرا خارجی اور پھر ان میں سے ہر ایک کی دو قسمیں ہیں۔ داخلی میں خود انسان کی ذاتی استعداد اور موروثی قابلیت شامل ہے۔ اور خارجی میں ان اسباب طبعی کا ذکر شامل ہے جو وقت پیدائش سے نشوونما تک انسان کو گھیرے ہوئے رہتے ہیں۔ اسی کے ساتھ اور نظامِ معاشرت کی تاثیر شامل ہے۔ یہ چار امر انسان کی سیرت کے جزو اعظم ہیں۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ مرزا عابد حسین کی سیرت پر ان کا کس حد تک اثر پڑا۔ ذاتی استعداد سے قطع نظر کر کے جب ہم اور اجزا کی طرف غور کرتے ہیں تو ہمیں اور لکھنؤ کے رہنے والوں میں اور ان میں کچھ زیادہ فرق نہیں معلوم ہوتا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ مرزا باقر حسین ان کے والد مرحوم نے ان کی تعلیم میں حتی الوسع غفلت نہیں کی۔ موروثی قابلیت کا یہ حال ہے کہ ان کے خاندان میں سوائے ان کے اور کوئی ایسا پڑھا لکھا نہ تھا جس کو پڑھا لکھا کہہ سکیں۔ والد ماجد ان کے فارسی میں کامل تھے۔ دادا جان صرف معمولی پڑھے لکھے تھے جیسے اس زمانے کے شرفاء پڑھے ہوتے تھے اور ان سے جو پہلے لوگ ان کے اجداد میں تھے وہ سب کے سب ان پڑھ۔ ناخواندہ (امید ہے کہ مرزا صاحب ہم کو معاف کریں گے) اکھڑ سپاہی تھے۔ ان لوگوں میں پڑھنا لکھنا عیب سمجھا جاتا تھا اور اس سے پیشتر کا حال ناگفتہ بہ ہے۔ دشتِ قپچاق کے قزاقوں کی حالت سے کون واقف نہیں ہے۔ نظامِ معاشرت کی طرف نظر کرنے سے بالکل میدان خالی دکھائی دیتا ہے۔ مرزا عابد حسین کے ہم محلہ ہم عمر لڑکوں میں سے کوئی بھی اس لائق نہ تھا جس کا ذکر ان کے افسانے کے ساتھ کیا جائے۔ گھر کے پاس کچھ کہاروں کے گھر تھے۔ ان کے لڑکوں میں درگا پرشاد کے سرفراز محل کی ڈیوڑھی پر کہاروں کا مہرا بن گیا۔ دبی بنیا محلّے میں

رہتا تھا۔ اس کا لڑکا مہکو لال سعادت گنج میں آڑھتیا ہو گیا۔ مسلمان شریفوں میں سے ایک صاحب فدا علی نامی جو بچپن میں چند روز تک ان کے ساتھ لال چرکو دن کے شوق میں شریک رہے۔ فدا علی نے پڑھ کے کبوتر پالے۔ یہ اسکول میں پڑھتے تھے۔ انھوں نے انٹرنس پاس کیا۔ انھوں نے سو کی ٹکری اسی دن اڑا کے نواز گنج تک بھیجی اور قربان علی نے جو اس فن میں استاد تھے ان کے پندرہ کبوتر مار لیئے۔ یہ انجینیر ہوئے۔ وہ نواب شہنشاہ مرزا کی سرکار میں کبوتر باز مقرر ہو گئے۔ جب یہ پنشن لے کے گھر آئے ہیں تو میاں فدا علی نے اس زمانے میں نوکری چھوڑ دی تھی۔ آخر میں انھوں نے یہ روزگار کیا تھا کہ کبوتر، بٹیر، بط، قازیں مول لے کے مٹیا برج روانہ کرتے تھے۔ محلہ میں ایک نواب صاحب رہتے تھے۔ بہو بیگم صاحبہ کے خاندان میں ان کے صاحبزادے سلطان مرزا چنڈو بنانے میں مشاق ہوئے۔ بالشت بھر چھینٹا لٹکتا ہوا انھیں کے قوام میں دیکھا۔ چھٹن نامے ایک لڑکا ان کے عزیزوں میں تھا۔ اس نے بٹیر کی جو پخ ایسی بنائی کہ شہر بھر میں شہرہ ہو گیا۔ علی حسین ایک اور ان کا ہجولی تھا۔ اس کو ورزش سے شوق تھا۔ بڑا ہو کے بے بدل بانکا ہوا۔ بڑے بڑے شورہ پشت اس سے ڈرتے تھے۔ سعادت گنج سے نخاس تک اور وہاں سے امین آباد تک اس کی دھاک تھی۔ حضرت عباس کا علم ایسا اٹھایا کہ اتنا اونچا علم اس سے پہلے شہر میں نہ اٹھا اور پھر اس طرح کہ ڈولچی باندھی نہ ڈوریاں لگائیں۔ ان کے پھوپھی کے دو بیٹوں میں ایک سوز خوان تھا۔ ایک حدیث خواں۔

مرزا باقر حسین کے احباب میں سے ایک بزرگ مرزا حمید حسین نامی اس محلے میں رہتے تھے۔ ان کو شاعری کا خبط تھا۔ حسرت تخلص فرماتے تھے۔

صاحبزادے ان کے تصدق حسین صاحب ان کے ہم مکتب تھے۔ پڑھے لکھے تو واجبی سے تھے مگر بقول شخصے (الولد سر لابیہ) تیرہ چودہ برس کے سن میں شعر موزوں کرتے تھے۔ وحشت تخلص تھا۔ طرح کی غزل کہہ کے مشاعرے میں پڑھی۔ ابتدائی غزل کا ایک شعر ایسا چست تھا کہ اس طرح کا یہ شعر ان کا یادگار رہ گیا۔ مشاعرے میں بار بار پڑھوایا گیا اور لوگ پڑھتے ہوئے گھر تک چلے گئے ؎

جنونِ قیس کا انداز جو تھا　　　اسے زندہ کیا وحشت ہمیں نے

اس شعر میں اگرچہ کوئی بات نہ تھی۔ مگر ایک تو تخلص نے لطف بڑھا دیا دوسرے کم سن لڑکے کی زبان سے ایسا بھلا معلوم ہوا کہ لوگ بہت ہی محظوظ ہوئے۔

ہمارے مرزا عابد حسین صاحب کو شعر کے مذاق سے حس ومس نہ تھا مگر یہ بات نہ تھی کہ سمجھتے نہ ہوں۔ اس لیے کہ فارسی اپنے والد سے بہت تحقیق کے ساتھ پڑھی تھی۔ جب میاں وحشت نے دوسرے دن بڑے فخر سے یہ شعر مرزا عابد حسین کے سامنے پڑھا تو انھوں نے اپنی یہ رائے ظاہر کی کہ ماحصل اس شعر کا یہ ہوا کہ قیس جیسا مجنوں تھا ویسا جنوں اس زمانے سے آج تک کسی کو نہیں ہوا ہم کو ویسا ہی جنون ہوا۔ میرے نزدیک تو اس شعر میں کوئی لطف نہیں ہے۔ نہ اس میں کسی حقیقت کا بیان ہے۔ نہ کوئی جذبۂ انسانی اس میں ظاہر کیا گیا ہے۔ مجنوں کا تصور ہمارا یہ ہے کہ وہ ایک شاعر تھا اور اسی کی معاصر لیلیٰ نامی ایک شاعرہ۔ عرب کے لوگوں کو زمانۂ جہالت میں بیہودہ شاعری سے انتہا کا ذوق تھا۔ اکثر صحبتیں اس قسم کی ہوا کرتی تھیں۔ جسے ہمارے زمانے میں مشاعرہ کہتے ہیں۔ مجنون اور لیلیٰ دونوں مشاعروں

میں شریک ہوا کرنے۔ گویا ان میں ایک قسم کا مقابلہ رہتا تھا۔ لیلیٰ ایسی خوبصورت نہ تھی مگر پھر بھی عورت تھی۔ عورتوں کی زبان میں قدرتی لوچ ہوتا ہے۔ مجنوں ازبسکہ اہلِ فن تھا۔ اس کو لیلیٰ کے اشعار بہت پسند آتے تھے۔ عشق کی اصل بنا یہ ہے۔ اگر قیس اسی حد تک رہتا تو اچھا رہتا۔ اب اس کو یہ ہوس ہوئی کہ لیلیٰ سے مواصلت ہو۔ اس لیے اس نے اپنے باپ کی زبانی شادی کا پیغام دیا۔ لیلیٰ کے باپ نے کسی وجہ سے انکار کر دیا۔ وجہ انکار کی جو بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ قیس اور لیلیٰ کی محبت مشہور ہو گئی تھی۔ اگر شادی ہو جاتی تو لوگ کہتے کہ پہلے سے ناجائز تعلق تھا۔ اسی ننگ کو لیلیٰ کے باپ نے گوارا نہ کیا۔ قیس کو از حد رنج ہوا۔ اپنے جذبات کو ضبط نہ کر سکا۔ اس لیے مجنون ہو گیا۔ اگر قیس کی سیرت میں قوت ہوتی تو وہ اس جذبے کو روکتا اور اسے روکنا چاہیے تھا۔ پھر ایسے ضعیف السیرۃ شخص کی برابری کرنا کون سی فخر کی بات ہے۔

راقم الحروف کے نزدیک عابد حسین صاحب کی یہ گرفت صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ مرزا عابد حسین نے تاریخی قیس کو شعر کا موضوع قرار دے لیا ہے تاریخی اور شعری قیس (جس کو فلسفہ کی زبان میں قیس مثالی کہنا چاہیے) بڑا فرق ہے۔ مثالیہ قیس کو اہلِ فن نے عاشق کامل کی جگہ رکھا ہے اور عشق کامل ضروری نہیں ہے کہ عورت ہی کے ساتھ ہو بلکہ عشقِ عرفانی اصل مقصود اعلیٰ ہے۔ اور بیشک مایۂ فخر ہے۔ انسان کامل وہی ہے جو صاحب معرفت ہو۔ اب رہی یہ بات کہ مرزا صاحب کے کلام سے یہ بھی ایک پہلو اعتراض کا نکلتا ہے کہ اس میں خودستائی ہے جیساکہ اکثر شعراء کا معمول ہے۔ یہ ایک امرِ لغو ہے۔ یہ اعتراض بھی درست نہیں۔ اس وجہ سے کہ شاعر جہاں ادعا اپنی

ذات کا کرتا ہے۔ وہاں اس کا مقصود اپنی ذات نہیں ہوتی بلکہ اپنی ذات کا مثالیہ (جسے انگریزی میں آئیڈیل کہتے ہیں) مقصود ہوتا ہے۔ یعنی اگر میں ایسا ہوتا جس کو شاعر بقاعدۂ مجاز مرسل یہ فرض کر لیتا ہے کہ میں ایسا ہو گیا۔ تو یہ فخر زیبا ہے۔ مثلاً یہ شعر ؎

لڑاتی ہے فلک سے مجھ کو میری ہمتِ عالی
تماشا دیکھ لیں زور آزمائی دیکھنے والے

اس شعر میں شاعر نے اپنی ہمت عالی پر فخر کیا ہے مگر یہاں بھی اس نے اپنی موجودہ حالت کو بیان نہیں کیا۔ بلکہ ایک خلقی قصد کا اظہار کیا ہے۔ معنی اس شعر کے یہ ہوئے کہ مجھے ایسا ہونا چاہیے کہ اگر مجھ پر آسمانی بلائیں نازل ہوں تو میں بڑی مردانگی سے اس کا مقابلہ کروں۔

مگر بات یہ ہے کہ مرزا صاحب کو ابتدائی عمر سے حقیقت میں مزورتِ طبیعی سے کام رہا ہے۔ عالمِ خیال کی طرف متوجہ ہونے کا ان کو بہت ہی کم موقع ملا۔ پھر اس کے ساتھ ریاضیات کے شوق نے طبیعت کو ملاحظۂ حقیقت کا اور بھی عادی کر دیا، فلسفہ اور شعر ان دونوں سے ان کو کوئی بحث نہ تھی۔ وہ مجسم تجربہ تھے۔

جن لوگوں کو محض علوم تجارتی کا شوق ہوتا ہے۔ اگر ان کی طبیعت کو فلسفہ اور شعر سے مغائرت ہو تو کوئی تعجب نہیں ہے۔ مگر ایسے لوگ مذہب کی طرف سے بھی بے پرواہ ہو جاتے ہیں لیکن ہمارے مرزا صاحب ایسے نہ تھے۔ وہ اپنے مذہب میں بہت ہی پختہ تھے۔ ان کا بیان تھا کہ میں اصولِ مذہب میں کوئی امر علوم تجارتی کے خلاف نہیں پاتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کا مذہب بھی تجربی تھا۔ از بسکہ ان کی نشو و نما ایسے مذہب میں ہوئی

تھی جس کا اصول بالکل حسن اور عقل پر ہے لہٰذا ان کو اس بات میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ ان کو اپنے مذہب کے اصول میں ایسی کسی بات کے ماننے کی ضرورت نہ تھی جو سمجھ میں نہ آتی ہو اور اسے تقلیداً مان لیتے ہوں۔ جیسا کہ بعض مذاہب کے اصول اولیہ محض تقلید پر ہیں۔ ان کا مذہب ایسا نہ تھا۔

اعتقادات کے باب میں ان کا یہ خیال تھا کہ جب مبادی مذہب درست ہوں تو امور تعبدی میں کوئی کلام نہ کرنا چاہیے۔

غزل گوئی، چائے نوشی، حقہ کشی، داستان یا سب سے عمدہ شغل مقدمہ بازی جو اکثر اہلِ شہر کا مذاق ہے۔ اس سے مرزا کو سروکار نہ تھا۔ ان کے مذاق کے دوست مثلاً سید جعفر حسین شہر میں موجود نہ تھے پھر شہر میں ان کا دل کیا لگتا۔ اپنے فارم (کشت زار) کو انھوں نے علمی اصول سے درست کیا تھا۔ اس فارم میں رہنے کا مکان تھا۔ زنانہ مکان سے ملا ہوا ایک اور مختصر سا مکان تھا۔ یہ ان کی لیبوریٹری (تجربہ گاہ یعنی وہ مکان جس میں حکماء علمی تجربہ کرتے ہیں) تھا۔ اسی میں حدادی اور نجاری کے آلات علم، کیمسٹری اور طبیعیات کا سامان اور مختلف کلوں کے نمونے رہتے تھے۔

فارم کے نزدیک علم نباتات کے نمونے جمع کرنے کے لیے ایک قطعہ کئی بیگھہ کا علیحدہ کر دیا تھا۔ اسی کے قریب سمر ہوس تھا جس میں ہزارہا قسم کے فرن اور باج اور مختلف اقسام کے خوش نما درخت جمع تھے۔ اسی سمر ہوس میں ایک بیضوی حوض بنا ہوا تھا۔ اس کے درمیان میں اور سمر ہوس کے چاروں طرف پہاڑوں کے نمونے بنائے گئے تھے۔ لیبوریٹری کے پاس آبزرویٹری (رصد خانہ) بنا تھا اور اسی سے ملا ہوا ایک چھپر کے نیچے موسم کے ملاحظہ کرنے کے آلات نصب تھے۔ ماڈل ہوس یعنی وہ کمرہ جس

میں طرح طرح کے نمونے کلوں کے جمع کیے گئے تھے، اسی کے قریب تھا وہاں سے کسی قدر فاصلے پر اصطبل اور مویشی خانہ تھا۔ اور اس سے کچھ فاصلے پر شاگرد پیشہ کے مکان تھے۔ یہاں فارم اگرچہ علمِ فلاحت کے تجربوں کے لیے مخصوص نہ تھا۔ مگر مرزا عابد حسین جس کشت زار کے کاشتکار ہوں، اس کو ایسا ہی سمجھنا چاہیے۔

کھیتی کا کل کام مرزا عابد حسین خود اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔ جوتائی، سراون، سینچائی، نکائی، غرض کہ کوئی کام سخت سے سخت اور مشکل سے مشکل ایسا نہ تھا جس میں مرزا نوکروں اور مزدوروں سے زیادہ کام نہ کرتے ہوں۔ نوکر بھی مرزا نے ایسے رکھے تھے جو کاہلی، حکم عدولی، بیہودہ حجت، بڑبڑانا جانتے ہی نہ تھے۔

زراعت کے کام کے لیے جو لوگ نوکر تھے بلکہ کل ملازموں کو خواہ مرد ہوں یا عورتیں، ایک طرح مرزا نے ان کو اپنا دائمی شریک بنا لیا تھا۔ پیداوار کی زیادتی اور کمی کے تناسب سے اناج حصہ رسدی تقسیم ہوتا تھا۔ اس لیے ہر شخص جی توڑ کے کام کرتا تھا۔ محنت اور برکت میں کچھ ایسا لزوم ہے کہ اگر ان کو مترادف لفظیں کہیں تو بے جا نہیں ہے۔ اوقاتِ فرصت میں مرزا اپنی لیبوریٹری میں رہتے تھے۔ ہر تجربہ اور مشاہدہ قلم بند کیا جاتا تھا۔ رصد خانے میں جو مشاہدات ہوتے تھے وہ علیحدہ کتاب میں تحریر ہوتے تھے۔ امور خانہ داری سے مرزا کو کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ مرزا اسے پسند کرتے تھے۔ جیسا کہ اس سے قبل ہم کہہ چکے ہیں۔ اس کو وہ بیوی کا فرضی کام سمجھتے تھے۔ گھر کا حساب کتاب سب وہ رکھتی تھیں۔ بیٹے بہو کا کارخانہ مرزا نے خود علیحدہ کر دیا تھا۔

تمام ملازمت کے زمانے میں مرزا پر بھی ایک سخت مصیبت پڑی تھی مرزا ہمیشہ نیک نام رہے۔ پہلے پہل سب اُوَرسیر ہوئے تھے۔ تیسرے درجے کے سب اُوَرسیر کی تنخواہ معمولی پچیس روپیہ اور سات روپیہ مہینہ بھتہ ہوتا ہے۔ بھتے کے روپے سے زیادہ گھوڑے پر صرف ہوتا ہے۔ بلکہ کچھ تنخواہ سے ملانا پڑتا ہے۔ یہ تنخواہ بہ مشکل ایک متوسط درجے کے شریف آدمی اور اس کے اہل و عیال کے لیے کفایت کر سکتی ہے مگر مرزا ایسے محتاط آدمی تھے کہ انھوں نے اور ان کی بیوی نے ہمیشہ اصولِ کفایت شعاری کی سخت پابندی کی۔ اس وجہ سے کبھی کوئی دِقت خرچ کی طرف سے نہیں ہوئی۔

مرزا نے تیسرے درجے کی سب اُوَرسیری سے لے کر اسسٹنٹ انجینیر کے درجے تک کی ترقی کی۔ ان کا ذاتی خیال یہ تھا کہ واقعات پر نظر کر کے اس سے زیادہ ترقی ممکن نہ تھی۔ یہ ترقی مرزا کی لیاقت دیکھتے ہوئے کچھ بھی نہ تھی۔ مرزا سے کم لیاقت لوگوں کی ترقی اس سے کہیں زیادہ ہوئی۔ افسوس ہے کہ ترقی کے باب میں بسا اوقات احتیاط اور لیاقت کارگذاری مفید نہیں ہوتی۔ اس کا کوئی معقول معیار موجود نہیں ہے۔ ترقی اور تنزلی، افسرِ اعلیٰ کی خوشی پر موقوف ہے۔ محکمہ جات سرکاری میں افسروں اور ماتحتوں کی تبدیلیاں بہت جلد ہوا کرتی ہیں۔ ان تبدیلیوں کے فوائد سے ہم اس وقت بحث نہیں کرتے۔ لیکن ایک ضرر خاص اس سے متصور ہے۔ وہ یہ کہ افسر اور ماتحت میں کسی قسم کی ہمدردی پیدا ہونے نہیں پاتی۔ ایک اوسط درجے کے قدرشناس افسر کو اس کا موقع بمشکل مل سکتا ہے کہ اپنے ماتحتوں کی دیانت، لیاقت اور کارگذاری کا اندازہ کر سکے۔ اس سے

اکثر حق تلفی ہوتی ہے۔ بہت سے مستحق محروم رہتے ہیں اور بہت سے غیر مستحق فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ ایک تو اکثر حالات میں افسر اور ماتحت مختلف قوم اور ملک کے لوگ ہوتے ہیں۔ مثلاً افسر انگلش مین اور ماتحت ہندوستانی مسلمان صاحب بہادر شہر کے باہر بنگلے میں فروکش ہیں۔ ماتحت وسط شہر کی کسی تاریک گلی میں رہتے ہیں۔ افسر اور ماتحت سے صرف دفتر میں سامنا ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کی سیرت اور اخلاق سے دونوں نابلد محض معمولی روزانہ کاروبار سے ماتحت کو اپنی لیاقت کے اظہار کا بہت ہی کم موقع مل سکتا ہے۔ مثلاً اسی محکمۂ تعمیرات میں ایک پل یا کوٹھی کا تخمینہ ایک عام درجہ کا اسٹیمیٹر بھی تقریباً اتنے ہی وقت میں کر سکتا ہے جتنی دیر میں ایک اعلیٰ درجہ کا لائق انجینیر۔ یہ ایک معمولی کام ہے۔ اس قسم کے کام دفاتر میں لیے جاتے ہیں۔ اس سے افسر کو کیوں کر یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ مرزا عابد حسین کی استعداد اور ذہانت اس سے زیادہ قابلِ قدر ہے جس کا اندازہ ان کے بُشرہ، قیافہ اور معمولی انداز کارگزاری سے کسی انگلش مین نے کیا ہے۔ ادائے حقوق کے لیے معقول پیمانہ معین ہونا چاہیے۔ نہ یہ کہ ایسا امر اہم محض بختِ اتفاق کے حوالے کر دیا جائے۔

یہ ایک قسم کی قرعہ اندازی ہے۔ ممکن ہے کہ قابلِ قدر صفات پر ان صاحبوں کی نگاہیں نہ پڑیں جن کی قدر شناسی پر کسی کے حقوق کا فیصلہ منحصر ہے۔ یہ سچ ہے کہ افسران محکمہ جات ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کی سی لیاقت کے نہیں ہو سکتے۔ لیکن جس کی حق تلفی ہوئی اس کو ایسے ہی چیف جسٹس کی ضرورت تھی۔ افسوس کہ ایک شخص کی عدمِ لیاقت سے دوسرے کا نقصان ہو۔ مگر ایسا ہوتا ہے۔ ہم اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکتے

کہ اس کا تدارک کیونکر ہوسکتا ہے۔ مگر شاید اس میں کسی کو کلام نہ ہوگا کہ ہونا چاہیے۔ شعراء اکثر نامساعدت زمانہ کی شکایت کرتے رہتے ہیں۔ مگر یہ مضمون محض شاعرانہ نہیں ہے۔ دنیا نے نیکوں کو بہت نقصان پہنچایا اور اس سے دنیا کا بہت نقصان ہوا۔ یہ مشہور مقولہ کہ ؎ ہر کسے را بہر کارے ساختند بہت ہی سچ ہے۔ یعنی ہر شخص ایک طبیعت اور مزاج خاص اور استعداد خاص لے کے پیدا ہوتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے وہ اس کام میں نہ لگایا جائے جس کے لیے وہ پیدا ہوتا ہے تو اس سے ضیاعِ قوت متصور ہے۔ اس سے علاوہ شخصی نقصان کے نوعی نقصان بہت ہوتا ہے۔ اگر جارج اسٹفنسن تمام عمر کول میں کام کرنے پر مجبور ہوتا تو شاید ریلوے انجن ابھی پلیٹ فارم تک ہرگز نہ آسکتا۔

ہاں جسے جو کچھ کرنا ہوتا ہے وہ کر ہی لیتا ہے۔ یہ مقولہ ایک حد تک صحیح ہے۔ چیونٹی ہمالیہ پہاڑ کاٹ کر نہیں پھینک سکتی۔ ایک متنفس نظامِ معاشرت کی بہت بڑی قوت کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اگر نظامِ معاشرت ہر ہر فرد کے لیے علیحدہ انتظام نہیں کرتا تو ضرور ہے کہ کوئی قانون ایسا نکال دیا جائے جس سے ضیاعِ قوت نہ ہو جس کا ذکر کیا گیا ہے۔

اگر مرزا عابد حسین کی سیرت سے ان کے افسر بالا آگاہ ہوتے تو شاید اعلیٰ ترین عہدۂ محکمۂ تعمیرات تک ان کی ترقی ممکن تھی اور یہ نہ صرف ان کی ذات کے لیے بلکہ ملک و قوم کے لیے مفید ہوتا۔

افسروں اور ماتحتوں کی اجنبیت سے ملک کا بہت بڑا نقصان ہوتا ہے۔ ناقدرشناسی کی وجہ سے اکثر متدین اور کارگزار ماتحتوں کے دل ٹوٹ جاتے ہیں۔ وہ لوگ جن میں شرافت و آزادی کا جوہر ہے وہ کولھو کے

بیل کی طرح ڈنڈے کے زور پر کام کرنا نہیں پسند کرتے مرزا عابد حسین صاحب کی طبیعت کے لوگ بھی ملک میں بہت ہیں۔ کسی نہ کسی طرح ان کی قدر شناسی کرنا نظامِ تمدن پر واجب ہے۔

جھوٹا مقدمہ جو مرزا صاحب پر دائر کیا گیا جس میں ایک معتد بہ رقم اس روپیے کی جسے انھوں نے کمالِ محنت اور جانفشانی اور کفایت شعاری سے برسوں کام کرکے پس انداز کیا تھا، بیرسٹروں کے نذر نہ ہو جاتی۔ اگر ان کے افسرِ اعلیٰ ان کے چال چلن سے کماحقہٗ واقف ہوتے

جو لوگ مرزا کو جانتے تھے وہ ایک لمحہ کے لیے بھی مرزا کی نسبت سوءِ ظن نہ کرتے۔ اگر ان کا افسر بے پروائی نہ کرتا تو اس جعلی مقدمہ کے عدالت تک پہنچنے کی نوبت ہی نہ آتی۔

مرزا کا قول تھا کہ مجھے اپنی زندگی میں افسروں کے استقرا ناقص اور اور سوءِ ظن سے بہت نقصان پہنچا۔ مذہب اور علم فری میسن کا پہلا اصول یہ ہے کہ ہر شخص کو بے گناہ سمجھو۔ اسی سبب سے جو شخص کسی جرم کے ارتکاب کا الزام لگائے اس کو ثبوت کامل پہنچانا واجب ہے اور اس پر بھی شبہ کا فائدہ ملزم کو دیا جاتا ہے مگر میرے ساتھ زمانے نے اس کے برعکس سلوک کیا۔ اس لیے کہ اکثر ایسے ہی لوگوں سے کام پڑا جو ہر شخص کو گناہگار سمجھتے تھے اور بارِ ثبوت بھی میرے ہی ذمہ تھا۔ مجھ ہی کو اپنی بے گناہی ثابت کرنا ہوتی تھی۔ اور شبہ بھی خلاف اصل اصول میرے ہی حق میں مضر تھا اگرچہ اس باب میں میرے ہی ملک کے نظامِ معاشرت کا قصور ہے۔ اس لیے کہ ملکی اخلاق کا معیار بہت گھٹا ہوا ہے۔ غیر ملکوں کے رہنے والے

اکثر ہندوستانیوں کو بے ایمان، کاہل اور بے وقوف سمجھتے ہیں۔ اس قاعدۂ کلیہ کے استثناء پر بہت ہی کم نظر جاتی ہے۔

مرزا کہتے تھے کہ دنیا ایمان دار لوگوں سے خالی نہیں ہے۔ فرماتے تھے کہ جس زمانے میں میں ضلع سہارنپور میں اُوور سیر تھا۔ میری اردلی میں ایک چپراسی تھا سید مسلمان اس کی سی احتیاط میں نے اس قسم کی تنخواہ والے ملازموں میں بہت کم دیکھی ہے۔ چپراسیوں کا قاعدہ ہے۔ جب دورے پر افسروں کے ساتھ جاتے ہیں۔ آٹا، دال، گھی، لکڑی، گڑ، تیل، مٹی کے برتن غرضکہ جملہ ضروریات جہاں تک ممکن ہوتا ہے غریب ناواقف دہقانوں سے طرح طرح کے فریب اور دھمکیاں دے کے بطور ناجائز حاصل کرتے ہیں۔ بسا اوقات ان کے افسر یعنی چھوٹے درجے کے عہدہ دار بھی اس مظلمے میں ان کے شریک رہتے ہیں۔ خدا رحمت کرے محسن علی پر، لکڑیاں تک مول لے کے جلاتا تھا۔ اس کو سوائے پانچ روپیہ ماہواری تنخواہ کے اور کسی قسم کے فائدے اٹھانے سے غرض نہ تھی۔ مثل اور عقلائے حال کے مرزا کا بھی یہی خیال تھا کہ اس زمانے کا اخلاق بہ نسبت زمانۂ سابق کے بہت ہی تنزل پر ہے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ محکموں اور دفتروں میں شاذ و نادر خدا کے بندے ایسے ہیں جو حرام و حلال میں فرق کرتے ہیں۔ اکلِ حلال اور صدقِ مقال جو سب سے زیادہ عمدہ صفات انسانی ہیں ان کا ذکر کہیں نہیں۔

نوکری سے پنشن لے کے جب وطن میں آئے تو مرزا صاحب نے چند موضع مضافات لکھنؤ میں خرید کیے۔ اور ایک قطعہ نزدلی لکھنؤ میں لی۔ نزدلی زمین پر صوم و صلوٰۃ اور جمیع اعمال خیر باطل ہیں۔ اس لیے اب یہ فکر ہوئی کہ اصل مالک مکان سے اس کو بحل کرالیں۔ بڑی مشکل سے

ورثائے اصل مالک زمین سے صرف ایک لڑکی نابالغہ ملی۔ ولی یا ولیہ جائز اس لڑکی کا کوئی موجود نہ تھا۔ سخت تردد ہوا۔

اس لڑکی کے ایک دور کے عزیز تھے۔ ان ہی کے قبضہ میں یہ لڑکی تھی۔ مرزا صاحب کو ایک نئی بات سوجھی کہ احمد علی کا عقد اس کے ساتھ کردیا جائے۔ اس صورت میں وہ زمین اصل مالک زمین کے پاس رہے گی اور اس کی اجازت سے اعمالِ خیر اس پر صحیح ہو جائیں گے۔

جو صاحب اس لڑکی کے سرپرست تھے وہ نہایت ہی غریب آدمی تھے اور اس لڑکی کی بھی کوئی جائداد موجود نہ تھی مگر مرزا صاحب اپنے ارادے میں مستقل تھے۔ مرزا صاحب کے اکثر عزیزوں کی لڑکیاں موجود تھیں اور مرزا صاحب کی وجاہتِ ذاتی اب اس قسم کی تھی کہ اگر کسی امیر خاندان میں لڑکے کا پیغام دیتے تو وہ بخوشی منظور کرلیتا۔ اس بات میں میاں بیوی کی رائے میں بھی کسی قدر اختلاف ہوا تھا مگر وہ تو عجب طرح کی نیک بیوی تھیں۔ جب مرزا نے اپنا اصلی منشاء ان پر ظاہر کیا تو سمجھ گئیں۔ چپ ہو رہیں۔

واقعی ان میاں بیوی میں ویسا ہی میل تھا جو خاص منشائے تزویج ہے۔ جس مقصد کے پورا کرنے کے لیے اس صانع عالم نے عورت کو خلق کیا ہے نہ یہ کہ جب سے گھونگھٹ کھلا بلکہ اس سے بھی پہلے میاں سے مورچہ باندھ لیا۔ ساس سے صید ہوگئی۔ نندوں سے تو تو میں میں جوتی بیزار ہونے لگی۔ کبھی منھ پھولا ہے، کبھی ناک چڑھی ہے کہیں کوس رہی ہیں اور جو گالیوں پر زبان کھلی تو ہفتا دپشت میں کسی کو نہ چھوڑا۔ میاں بیوی کے باہمی معاملے میں ایک خاص بات اعتبار ہے۔ چاہیے کہ میاں کو بیوی پر

اور بیوی کو میاں پر اعتبار ہو۔ گھر کا کارخانہ چل ہی نہیں سکتا جب تک کہ ساکھ نہ ہو۔ نہ یہ کہ ادھر میاں نے کوئی بات کی اور ادھر بیوی نے کہا "چل جھوٹے"؛ یا اگر بڑی تہذیب کی "اچھا یوں ہی ہو گا۔ پھر کسی کو کیا"۔ اور باہمی اعتبار میاں بیوی دونوں کے لیے ہوتا ہے۔ راست بازی اصل اصول ہے۔ ع راستی موجبِ رضائے خدا است

خدا ان ہی افعال سے راضی ہوتا ہے جن میں ہمارا تمہارا دنیا کا فائدہ ہے۔ ورنہ خدا ہمارے تمہارے بلکہ تمام عالم کے افعال سیّئہ وحَسنہ سے بے نیاز ہے۔ اصل ایمان اسی کا منشا ہے کہ اصلی معاشرت کے اصول ٹھیک مناسب ہوں۔ سب اس طرح مل جل کر رہیں کہ ہر شخص سے فائدہ پہنچے۔ بابِ مدینۃ العلم حضرت امیرالمومنین علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے پوچھا: "مَا الْکُفْرُ یَا اَمِیْرَالْمُؤْمِنِیْن" اے امیرالمومنین کفر کیا ہے۔؟ حضرت نے ارشاد فرمایا: "اشراک باللہ و اضرار بالناس" یعنی خدا کی ذات میں کسی کو شریک کرنا اور آدمیوں کو ضرر پہنچانا۔ واقعی کیا جامع و مانع تعریف کفر کی ارشاد فرمائی ہے۔ ہر شخص جس کو کچھ بھی خدا کا خوف ہو "اضرار بالناس" سے بچتا رہے کہ اصل کفر ہے۔ زہد ریائی، خشک ملائی۔ غرضکہ ہر طرح کی خودنمائی اور خود آرائی اور باطن میں محض ہیچ بلکہ رات دن میں لوگوں کا مال غصب کرنے اور خلق اللہ کو ضرر پہنچانے کی فکر میں رہنا۔ ایسے لوگوں کا ایمان دار ہونا وہی بات ہے جیسے۔ ع برعکس نہند نامِ زنگی کافور، کم ازکم میاں کو بیوی سے اور بیوی کو میاں سے ایسی معاملت رکھنا چاہیے کہ دونوں مل کر ایک ذاتِ واحد کے حکم میں ہو جائیں اور اس کے ساتھ ہی دونوں کو اپنے اپنے فرائض بھی سمجھ لینا چاہیے

یہ یاد رہے کہ حکیم مطلق کا کوئی فعل (معاذ اللہ) عبث نہیں ہے۔ انسان اعلیٰ درجے کے مصنوعاتِ الٰہی میں سے ہے بلکہ مذہب اور حکمت اِس سے زیادہ کا دعویٰ کرتے ہیں اور انسان کو اشرف المخلوقات ٹھہراتے ہیں پھر اس کا خلق بوجہ اولیٰ عبث اور لغو نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد ہمیں اپنے افعال پر غور کرنا چاہیے کہ آیا ان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس مقصود کے لیے ہم پیدا کیے گئے ہیں، وہی کام ہم کرتے ہیں یا نہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو حیف ہے۔ اب یہ کیونکر معلوم ہو کہ ہم کس کام کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ جن لوگوں کو عقلِ سلیم ہے وہ اپنے استعدادات اور قویٰ سے خود ہی اس مسئلے کو حل کر سکتے ہیں۔ اس طرح سے کہ جب آنکھ کھول کر عالم کو دیکھتے ہیں اور اشیاء کے باہمی تعلقات پر نظر کرتے ہیں اور چیزوں کا تعلق اپنی ذات کے ساتھ اور اپنی ذات کا تعلق دوسری چیزوں کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ اب ان چیزوں میں ذوی العقول اور غیر ذوی العقول دونوں شامل ہیں۔ ہمارے تعلقات دونوں سے ہیں اور جس سے از روئے جنسیت اور نوعیت کے تقارب بڑھتا جاتا ہے۔ اُس کی نسبت سے تعلقات بھی زیادہ ہوتے جاتے ہیں۔

میاں بیوی کا تعلق بالکل انوکھا ہے۔ اس کو محدود کرنا سخت مشکل ہے مگر بعض حیثیتوں سے تمام تعلقات پر اس کو تفوق ہے۔ ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ اکثر صورتوں میں یہ دونوں اپنے فرائض کو نہیں سمجھتے۔ اس سے طرح طرح کی خرابیاں واقع ہوتی ہیں۔

متاخرین میں سے ایک حکیم کا یہ خیال ہے کہ میاں بیوی دونوں کو خود مختار ہونا چاہیے۔ ہر واحد کے معاملات اور مال علیحدہ علیحدہ ہوں،

مثلاً میاں اگر کسی کارخانے میں کام کرتے ہیں تو بیوی ایک دفتر میں ملازم۔ مثلاً میاں پچاس روپے ماہوار پیدا کرتے ہیں تو بی بی سو روپیہ۔ دونوں اپنا اپنا کھاتے ہیں اپنا اپنا پہنتے ہیں۔ ایک دوسرے کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں نہ یہ آپ کے محتاج ہیں نہ وہ آپ کی۔ مگر دونوں میں محبت ہے۔ اس وجہ سے دونوں ایک ساتھ یا اکثر اوقات راحت یا تعطیل کے وقت ایک ساتھ رہتے ہیں۔ صرف اسی قدر تعلق ہے اور کچھ نہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ عندالحاجت ایک دوسرے کی مدد کرنے کو موجود ہیں۔ مگر ہر واحد ان میں سے اس کی سعی کرتا ہے کہ اپنا بار کسی قسم کا کیوں نہ ہو دوسرے پر نہ ڈالیں۔

ہر ایک کی ان میں سے یہ کوشش ہے کہ جہاں تک ممکن ہو خواہ اپنی ذات پر تکلیف ہی کیوں نہ ہو دوسرے سے مدد نہ لیں بعینہٖ اسی طرح جیسے احباب میں ایک دوسرے سے مدد لینا عار سمجھا جاتا ہے خصوصاً معاملاتِ زر میں۔

اس حکیم نے جو صورت تزویج کی قرار دی ہے بیشک قابلِ غور ہے۔ اس امر پر دو حیثیتوں سے غور کرنا چاہیے۔ ایک تو یہ کہ ایسا ممکن ہے یا نہیں۔ دوسرے یہ کہ بالفرض امکان اس صورت میں فائدے کیا ہیں اور نقصان کیا ہیں۔

قطع نظر نقصان اور فائدوں کے اس میں ایک امر کی کمی ہے وہ یہ کہ استقرار اور تعینِ منزل کسی طرح ممکن نہیں "یعنی گھر نہیں بن سکتا"۔ گھر کا مفہوم ایک ایسی چیز ہے جس کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ ہر شخص کو جس کو خدا نے دنیا میں گھر دیا ہے وہ اس کو سمجھ سکتا ہے۔ یہ بعینہٖ ایسی بات ہے جیسے کوئی سرخ یا سبز کسی رنگ کی تعریف کرنا چاہے۔ یہ ایسی

چیزیں ہیں جن کا ادراک صرف مشاہدے پر موقوف ہے۔

اس حکیم نے جو صورت تجویز کی ہے اس میں مرد عورت دونوں اپنا اپنا کام کرتے ہیں۔ فرض کیا جائے کہ میاں مثلاً گھڑی سازی کی دکان کرتے ہیں۔ میاں ۸ بجے شب کو دکان بند کر کے گھر پر آتے ہیں اور بی بی ساڑھے پانچ بجے دفتر سے تشریف لاتی ہیں۔ امور خانہ داری سب ملازمین کے محول ہے (بشرطیکہ ملازم رکھنے کا مقدور بھی ہو) ملازمین نے کھانا پکا رکھا بچھونے بچھا دیے۔ دونوں میاں بیوی رات کو سو رہے۔ صبح کو کھانا وانا کھا کے دونوں صاحب پھر اپنے اپنے کام پر گئے۔

یہ زندگی چند روز تک بہت اچھی طرح گذر سکتی ہے لیکن فرض کیا جائے میاں یا بی بی دونوں میں سے کوئی بیمار ہو گیا اس صورت میں ضرور ہے کہ ایک دوسرے کی مدد کریں۔ اگر بی بی بیمار ہوں تو میاں کو رخصت لینا ہوگی اور میاں بیمار ہوں تو بی بی کو اور اگر یہ نہ ہو تو ملک کی طرف سے کوئی ایسا انتظام ہو کہ بیماروں کی تیمارداری کسی خاص ہسپتال میں کی جائے مثلاً اگر میاں بیمار ہوں تو چاہنے والی بی بی صرف اپنے دل ہی میں خالی میاں کی حالت پر افسوس کرتی رہیں۔ میاں کی تیمارداری ان لوگوں کے حوالے ہے جو ہسپتال سے قلیل تنخواہ پاتے ہیں۔ ایک تو میاں بیمار ہوئے۔ دوسرے پیاری بی بی سے چھوٹے۔ خدا ہی ان کی جان کا حافظ ہے۔

اگر یہ مرض الموت ہوا اور میاں نے انتقال کیا۔ اب بیوی اس فکر میں ہیں کہ میاں کی یادگار قائم کی جائے۔ چندے کی فہرست بنا کر اور بازو پر سیاہ کپڑا باندھ کر احباب سے چندہ تحصیلتی پھرتی ہیں۔ یہ ان لوگوں کی ہمت کا ذکر ہے جو کہ نامی اور نامور ہیں۔ ورنہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مر گئے مردود جن کا

فاتحہ نہ درود۔ بیوی نے تزویج کا معاہدہ کسی اور سے کرلیا۔

یہ تو اس صورت میں تھا کہ جب دو سے تیسرا نہ ہو۔ جیسا کہ حکیم موصوف کی رائے ہے کہ سلسلۂ توالد کو قطع یا محدود کرنا چاہیے یعنی اولاد نہ ہو یا ایک دو سے زائد نہ ہو۔ اس صورت میں یہ قاعدہ شاید مستحسن ہو لیکن حکیم موصوف کی رائے کے برخلاف اگر کسی بیوقوف مرد یا عورت کو اولاد کی ہوس ہوئی تو سخت مشکل پڑے گی۔ اسکے لیے بیوی کو وقتاً فوقتاً سِک لیو (رخصتِ بیماری) لینا پڑے گی اور اگر اس بیماری نے ترقی کی تو نوکری تشریف لے جائے گی اور اس صورت میں ایک امر اہم یہ ہے کہ معاملۂ معاشرت میں جب مرد اور عورت دونوں کا نذر اور دونوں کے حق مساوی ہیں تو اولاد کی پرورش اور تربیت اور تعلیم کا بار کس کے ذمے ڈالا جائے۔ اس حالت میں یا تو (اسٹیٹ) سلطنت کی طرف سے لڑکوں کی پرورش کا بندوبست ہوگا اور اگر بر سبیل ترحم والدین نے خود اپنے ذمہ لے لیا۔ دونوں خدا کے فضل سے برسرِ کار ہیں۔ سوائے اس کے کہ ٹھیکہ پر دے دی جائے اور کیا ہو سکتا ہے۔ ہر ایک اولاد کو وہی لطف آئے گا جو حضرت آدم کو آیا ہوگا۔ باپ کی شفقت اور آغوشِ مادر کا لطف دونوں سے محروم رہے گا۔

خلاصہ یہ کہ رفتہ رفتہ تمام انسان یہ سمجھنے لگیں گے کہ گویا وہ بذریعہ کلوں کے پیدا کیے گئے ہیں اور اصول میکانی کی بنا پر ان کی پرورش ہوئی ہے۔ اس حالت میں حقوقِ والدین کا حس و مس کسی اولاد کو باقی نہ رہے گا اور رفتہ رفتہ وہ حالت پیدا ہوگی کہ صاحبزادے بلند اقبال ہائی کورٹ کے جج ہیں اور والد ماجد خیرات خانے کے ٹکڑے توڑ رہے ہیں۔

مرزا صاحب کا مفہوم میاں بیوی کا یہ تھا کہ دونوں وجود اور بقائے

منزل کے لیے لازم و ملزوم ہیں اور دونوں کے جدا جدا فرائض ہیں۔

مرد کا فرض ہے منزل کے لئے ضروریات کا مہیا کرنا۔ عورت کا فرض ہے منزل کی اندرونی حالت کو درست رکھنا۔ یہ دونوں کے فرض ان دو لفظوں سے بہت اچھی طرح تعبیر کیے جا سکتے ہیں۔ مرد کا فرض۔۔۔۔ کمائی۔ عورت کا فرض۔۔۔۔ گرہستی۔ ان دونوں میں جس نے اپنا فرض ادا نہیں کیا وہ خدا کا بھی گناہ گار ہے اور نظام معاشرت کا بھی اور اس گناہ کی دنیا میں یہ سزا ہونا چاہیے کہ ایسے مرد یا عورت کے حقوق منزلی ضبط کر لیے جائیں۔ نکھٹو میاں شوہریت کی لیاقت نہیں رکھتا اور پھوہڑ عورت اس قابل نہیں کہ وہ کسی شریف کی بی بی ہو سکے۔

سکینہ (اس لڑکی کا نام تھا جس کے ساتھ مرزا صاحب نے احمد علی کا عقد تجویز کیا تھا) کا سن دس گیارہ برس کا تھا۔ بھولی بھالی صورت تھی۔ ماں باپ دونوں ہی بچپنے کے زمانے میں مر چکے تھے۔ ماں کے مرنے کے بعد اس کو خالہ نے اپنی حمایت میں لے لیا تھا۔ وہ بھی قضائے الٰہی سے فوت ہو گئیں۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب سکینہ کا سن سات برس کا تھا۔ اب یہ لڑکی خالو کے پاس رہی۔ انھوں نے بھی زوجہ کے مرنے کے بعد عقد ثانی کیا۔ اس سے ناظرین بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ جس گھر میں رہتی تھی اس گھر کے مالکوں میں کسی کو سکینہ کے ساتھ کوئی طبعی تعلق نہ تھا۔ اس یتیم لڑکی کی پرورش ایک ترس خدا کا کام تھا۔ سکینہ کے خالو بیچارے بہت ہی غریب تھے۔ مرثیہ خوانی کرتے تھے۔ سال بھر کے بعد سو روپیہ ان کو ایک دیسی ریاست سے ملتے۔ اس پر چار اولادیں زوجۂ اولیٰ سے، ایک لڑکی زوجۂ ثانیہ سے۔ سکینہ کا نصیب اچھا تھا کہ مرزا صاحب کے دل میں اس کی محبت پیدا

ہوگئی مگر اس میں ایک مشکل یہ تھی کہ احمد علی کا سن پندرہ برس کا تھا۔ وہ ابھی مڈل کلاس میں پڑھتا تھا۔ مرزا کی یہ رائے تھی کہ انٹرنس پاس کرنے کے بعد شادی کر دینا چاہیئے۔ مرزا بچپنے کی شادی کے خلاف تھے مگر جوان ہوتے ہی لڑکے لڑکی کی شادی کر دینے کو فرض سمجھتے تھے۔

مرزا نے سکینہ کے خالو سے مل کر اس کو اپنی سرپرستی میں لے لیا اور فرزندوں کی طرح پرورش کرنے لگے۔ سکینہ دبی دبائی لڑکی تھی۔ چند ہی روز میں مرزا صاحب کی بیوی نے اسے اپنے ڈھنگ پر لگا لیا۔ تین برس کے بعد احمد علی کے ساتھ عقد کر دیا گیا۔

جس طرح مرزا نے بہو کو تعلیم دی۔ بعینہٖ یہی خیال داماد کی نسبت تھا۔ مگر اس مطلب کے لیے انھوں نے کسی لڑکے کو پرورش نہیں کیا۔ اس میں یہ لم تھی کہ اگر ایسا کیا جائے گا تو صاحبزادے سسرال کے ٹکڑے توڑنے کے عادی ہو جائیں گے۔ ان سے پھر کوئی کام نہ ہوگا۔ لڑکی ایسے لڑکے سے نہ دبے گی۔ عمر بھر بے لطفی رہے گی مگر اب لڑکی بھی بیاہنے کے لائق ہو گئی ہے۔ آخر اپنے دوستوں میں سے ایک صاحب واحد حسین نامی تھے۔ انھوں نے شادی کا پیغام دیا۔ لڑکے کے چال چلن سے مرزا بخوبی واقف تھے۔ اس لیئے کہ اگرچہ پہلے سے اس کا سان دگمان بھی نہ تھا کہ اس لڑکے کے ساتھ لڑکی کا عقد کیا جائے گا۔ لیکن مرزا کو اپنے اور اپنے احباب کے لڑکوں کی تعلیم سے ایک قدرتی لگاؤ تھا۔ اس لیئے مرزا اس لڑکے کی حالت سے بخوبی واقف تھے۔ پیغام آتے ہی مرزا نے منظور کیا۔ معمولی رسوم کے بعد شادی کر دی گئی۔ لڑکے لڑکی دونوں کی شادیوں میں مرزا صاحب نے خلافِ جمہور تمام بیہودہ رسموں کو ترک کر دیا۔ خاص احباب کی دعوت کے

سوا اور کسی قسم کا سامان نہیں کیا گیا۔ نہ رنڈیاں ناچیں۔ نہ بھانڈ بھگیتوں کو بلایا۔ لڑکے کی شادی میں تو دونوں طرف کا اختیار خود ان ہی کو تھا۔ سکینہ کے خالو برائے نام شریک ہو گئے تھے اور جو کچھ انھوں نے سکینہ کو اپنی خوشی سے دیا اس کو نہایت ہی شکر گزاری سے منظور کر لیا۔ لڑکی کی شادی میں یہ شرط پہلے ہی کر لی گئی تھی کہ مانجھا۔ ساچق۔ برات لبطور متعارف نہ ہوگا۔ صرف شرعی عقد کیا جائے گا۔ دولھا کی ماں کو ڈومنیوں کے بلوانے پر بہت اصرار تھا مگر مرزا صاحب نے ہرگز منظور نہ کیا۔ شربت پلائی کی رسم کو مرزا بہت ہی برا جانتے تھے۔ اس لیے اکثر عزیزوں اور دوستوں سے بگڑ گئی۔ مگر مرزا ان لوگوں میں نہ تھے جن کو کسی امرِ معقول میں نظامِ معاشرت کی متابعت میں کوئی عذر نہیں ہے۔ اِلّا ان امور میں جو خلافِ خدا و رسولؐ یا خلافِ عقل ہوں۔ امورِ جائز میں ہم نظامِ معاشرت کی اسی طرح فرماں برداری کریں گے جس طرح سلطنت کے قانون کی یا تشریع کے احکام کی۔ مگر جو رسم اور قانون کے خلاف ہوگا۔ اس میں نظامِ معاشرت کا مقابلہ پوری قوت سے کیا جائے گا۔ لڑکے لڑکیوں کی شادیوں کے بعد مرزا بہت ہی سبکدوش ہو گئے۔ اب انھوں نے وہ طریقۂ زندگی اختیار کیا جس سے دنیا میں بہشت کا لطف آتا تھا۔ بشرطیکہ بہشت میں طبعی محنت بھی اسبابِ عیش میں داخل ہو۔ مرزا کا یہ خیال تھا کہ بغیر محنت کے زندگی بسر ہی نہیں ہو سکتی۔

اب انھوں نے لکھنؤ کے قریب ایک موضع میں ایک قطعہ زمین خود کاشت کیا۔ سال میں صرف دو ایک مہینہ لکھنؤ میں رہتے تھے۔ باقی تمام سال، گویا وہیں گھر تھا۔ شہر میں مرزا کا دل نہ لگتا تھا اس لیے کہ یہاں ان کی دلچسپی کا کوئی سامان مہیا نہ تھا۔ ان کے دو شغل تھے۔ ایک مشقت۔ دوسرے

کتب بینی۔ شہر کے لوگوں کو ان دونوں باتوں سے نفرت۔ ان کا خاص شغل
جس سے مرزا کو نفرت کلی تھی۔ کبوتر بازی۔ بٹیر بازی تھی۔

اگرچہ بچپنے کے دوستوں کا اثر مرزا عابد حسین کی سیرت پر نہیں پڑا اور
یہ امر قابلِ ستائیش ہے کہ وہ اس اثر کی خرابی سے محفوظ رہے لیکن عام نشو و نما
کے بعد البتہ اکثر قوی طبیعتوں نے ان پر اثر ڈالا اور اس کا انھیں ممنون
ہونا چاہیئے۔

مثلاً سید جعفر حسین صاحب جن کو ان سے خاص محبت تھی۔ سید صاحب
کی سیرت قوم اور ملک کے لیے ایک عمدہ مثال ہے۔ ابتدائی عمر سے
سید صاحب کے قویٰ اس لائق نہ تھے کہ وہ کسی قسم کی سخت طبعی مشقت کر سکیں۔
اس لیے تعلیم انگریزی اعلیٰ درجے کی حاصل نہ کر سکے۔ صرف انٹرنس
کلاس پہنچ کے بہ سبب علالت مدرسہ چھوڑنا پڑا۔ مگر مصلحت اندیش ذہن
انسان کو ہرگز بیکار نہیں چھوڑتے۔ اس لیے انھوں نے رڑکی کالج کے
داخلے کا امتحان پاس کیا اور اس مدرسے میں داخل ہو گئے۔ یہاں انھوں
نے اپنی بالاستقلال محنت اور نیک چال چلن سے اپنے استادوں کو بہت
ہی خوش رکھا۔ اگرچہ اس مدرسے میں ایک صاحب اور بھی لکھنؤ کے رہنے
والے اس زمانے میں داخل تھے اور سید صاحب اور وہ بوجہ ہموطن
ہونے کے ایک ہی بارک بلکہ ایک ہی کمرے میں مقیم تھے۔ یہ دوسرے
حضرت انتہا کے کاہل، فضول خرچ اور سب سے بڑا خبط شاعری کا ان کے
دماغ میں سمایا ہوا تھا۔ رڑکی کالج میں داخل ہو کر بجائے اس کے کہ وہ تعلیمی
کورس کو یاد کرتے۔ غالب اور ذوق کے دیوان حفظ فرماتے تھے۔ سرِ شام

سے آدھی رات بلکہ اس سے کچھ زیادہ دیر تک اپنا اور اپنے ساتھیوں کا وقت ضائع کرنے کے سوا ان کو کوئی اور کام نہ تھا۔ صبح کو ماشاء اللہ اس وقت سو کے اٹھتے تھے جس وقت کالج کا گھنٹہ بجتا تھا۔ یعنی ساڑھے دس بجے۔ پھر اس وقت بھی اگر ان کا شاہانہ مزاج درست ہوا تو کالج گئے ورنہ بارک ہی میں پڑے رہے۔ ماہواری امتحانوں میں کتابیں دیکھنا قسم تھا صرف امتحان سے ایک دن پہلے جب طلباء آپس میں بیٹھ کر مباحثہ کیا کرتے تھے۔ اس میں خوفِ خدا کر کے شریک ہو جاتے تھے۔ مگر نہیں معلوم کیا خدا کی قدرت تھی کہ کسی امتحان میں فیل نہ ہوئے۔ صرف پاس ہونے بھر کے مارکس (نمبر) مل جایا کرتے تھے۔ حضرت کو اس کا فخر تھا۔ سالانہ امتحان میں خدا خدا کر کے پاس ہو گئے اور ایک سال کے لیے سید صاحب کو اپنے حال پر چھوڑ کے کالج سے نکل آئے۔ نوکری پر بھی ایشیائی شاعری کا زہریلا اثر اور ان کے ملزوم کاہلی، بے پروائی، بد دماغی کو لیے ہوئے پہنچے۔ بھلا ایسوں سے نوکری کیا ہوتی۔ ڈیڑھ دو برس کے بعد موقوف کر دیے گئے۔ پھر مستقل سرکاری ملازمت نہ ملی۔ خدا جانے کس طرح ہیں اور کیونکر ہیں۔ ان حضرت کے کالج سے نکل آنے کے بعد سید صاحب کا پیچھا چھوٹا۔ اب سید صاحب نے مستقل محنت کرنا شروع کی۔ دوسرے سال کے امتحان میں (جو رڑکی کالج کا آخری امتحان ہے) دوسرے درجے میں پاس ہوئے اور ایک مضمون میں انعام بھی پایا۔ اس کے بعد محکمۂ نہر میں ملازم ہوئے اور اس محکمہ میں اب بھی اعلیٰ درجے کے عہدے پر ہیں۔ میں پہلے ایک مقام پر لکھ چکا ہوں کہ مرزا عابد حسین نے انجینیری کا امتحان آپ ہی کی رائے سے پاس کیا تھا۔ بلکہ اس امتحان کے پاس کرنے میں آپ نے بڑی مدد کی۔ پیمایش ولیول، نقشہ کشی،

تخمینہ عمارات وغیرہ سب آپ ہی سے سیکھا تھا۔

سید صاحب کو ان کے ساتھ اور ان کو سید صاحب کے ساتھ خاص درجے کا خلوص تھا۔ وہ آپ کی مدح و ثنا غائبانہ کیا کرتے تھے اور یہ ان کی تقلید کرتے تھے اور وہ ان کی۔ مذاق دونوں کا ملتا تھا۔ شعر و شاعری سے ان کو بھی نفرت تھی اور انھیں بھی۔ سمجھتے دونوں تھے۔ مگر واقعیت میں اس قدر غرق تھے کہ مضامینِ خیالی ان کو ہیچ و پوچ معلوم ہوتے تھے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے۔ سید جعفر حسین صاحب کے وہی لکھنوی ہموطن جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ فصیح الملک نواب مرزا صاحب داغ دہلوی کا تیسرا دیوان بڑے ذوق و شوق سے خرید کر لائے۔ سید صاحب اس وقت موجود تھے۔ خدا جانے کیا جی میں آیا۔ دیوان اٹھا کے دیکھنا شروع کیا۔ اتفاق سے پنسل ہاتھ میں۔ اشعار نظری کرنا شروع کر دیے۔ صفحہ کے صفحہ کاٹ دیے اور بعض اشعار پر کچھ حاشیے بھی چڑھائے۔ بس یہی مذاق بعینہٖ مرزا عابد حسین صاحب کا بھی تھا۔ میکانکس میں دونوں کو اعلیٰ درجہ کی قابلیت تھی۔ سیکڑوں کلوں کی تجویزیں روزانہ ہوا کرتی تھیں۔ نقشے بنا کرتے تھے بلکہ اگر مقدور ہوا تو اس کے نمونے بھی بنوائے گئے۔ ورنہ آرزوئیں دلوں میں رہ گئیں۔

مرزا عابد حسین کے عزیزوں میں سے بھی کوئی ایسا موجود نہ تھا جس سے مرزا عابد حسین کے اخلاق کو کوئی نفع پہنچا ہو۔ ان کے ایک عزیز کا تذکرہ یہاں بطور نمونے کے کیا جاتا ہے۔

مرزا عابد حسین کے دور کے رشتہ داروں میں ایک شخص مرزا فدا حسین

نامی لکھنؤ کے رہنے والے بہت تباہ حال اور پریشان تھے۔ کسی قدر فارسی پڑھے ہوئے تھے اور بچپنے سے شعر گوئی کا بھی خبط تھا۔ اس نے طبیعت کو اور نازک کر دیا تھا۔ مرثیہ خوانی کے شوق نے صبر و قناعت کا سبق پڑھا دیا تھا۔ سال بھر کے بعد عشرہ محرم میں کسی سرکار سے صرف پچیس روپیے کی آمد تھی۔ اس میں کیا ہوتا تھا۔ ایک بی بی۔ ایک آپ۔ ایک لڑکا۔ دو لڑکیاں تھیں۔ غرض کہ یہ سب بندے خدا کے افلاس کے پنجے میں گرفتار تھے۔ نہ کوئی صورت مفر کی آپ سے آپ نظر آتی تھی کہ اس بلا سے نجات حاصل ہو اور نہ اتنی ہمت اور عقل تھی کہ خود اپنی سعی بازو سے مخلصی حاصل کریں۔ جو لوگ لکھنؤ کے نظام معاشرت سے واقف ہیں ان سے تو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ مگر ہاں اور لوگوں کو اتنا بتانا ضرور ہے کہ یہاں کے رہنے والے عموماً عقل معاش سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ شہر اب ایسا مفلس ہو گیا ہے کہ یہاں کے متوسط درجے کے لوگوں میں سے اکثر کو آپ فکرِ معاش میں مبتلا پائیے گا اور اگر کسی چلتے پرزے آفت کے پرکالے کو عقلِ معاش ہے بھی تو وہ عقلِ فساد کے ساتھ ملی ہوئی۔ نیک اور جائز وسیلوں سے روپیہ پیدا کرنا یہاں کے لوگ ناممکن خیال کرتے ہیں اور دنیا بھر میں روپیہ پیدا کرنے کے لیے طرح طرح کی تدبیریں سوچی جاتی ہیں۔ کوئی اس فکر میں ہے کہ یا کوئی پیشہ سیکھیں یا کوئی نوکری کریں۔ یا اگر کسی قدر راس المال پاس ہے تو کوئی دکان کھولیں یا کوئی کارخانہ کریں۔ یہاں اس قسم کی کوشش کرنے والے پست خیال، ادنیٰ درجے کے لوگ، چھوٹی امت والے سمجھے جاتے ہیں اور جو شخص ایسا کر لیتا ہے وہ گویا دائرۂ تشخص سے نکل جاتا ہے مثلاً ان لوگوں میں جو اہلِ تشخص میں داخل ہیں (یہ وہی لوگ ہیں جن کے آباو اجداد صاحبِ ثروت تھے۔ یہ بزرگ ثروت کو تو

اپنے ساتھ ملک عدم کو لیتے گئے۔ مگر محض تشخص اور نخوت جو کہ لازمی صفات اس ثروت کے تھے، اپنی اولاد کی میراث میں چھوڑ گئے۔ اگر کسی نے کوئی پیشہ کر لیا تو وہ بیچارہ انگشت نما ہو جاتا ہے۔ پھر کیا کریں؟ یہ مجھ سے سنیے:۔

۱۔ اگر عربی شد بد پڑھی ہے اور شکیاتِ نماز اور مسائلِ روزمرہ سے واقف ہے کسی مجتہد سے بہ سعی و سفارش یا بہ اظہارِ رسوخیت خاندانی اجازت حاصل کر کے پیش نماز بن جائے۔ لکھنؤ میں تو خیر مگر اکثر باہر کے دیہاتی قصباتی بہت سے معتقد ہو جائیں گے۔

۲۔ اگر چوگوشیہ ٹوپی قالب پر چڑھا تا جانتا ہے۔ کسی نامی مرثیہ خواں کا شاگرد ہو جائے اور ان سے کوئی رقعہ لے کر باہر چلا جائے۔ حسب حیثیت لباس و تشخص ظاہری کچھ نہ کچھ وصول ہو جائے گا۔

۳۔ اگر کچھ پڑھا نہیں ہے۔ صرف کسی قدر قرات سے واقف ہے۔ خصوصاً ذال اور ضاد کو بہ صحت ادا کر سکتا ہے۔ کسی میت کے روزہ نماز کا اجورہ لے۔ نماز پڑھے یا نہ پڑھے۔ روزے رکھے یا نہ رکھے۔ یہ اس کا ایمان جانے یا حج یا زیارت کا معاملہ کرے۔

۴۔ اگر علم مجلس سے واقف ہو کسی رئیس کا دربار کرے۔ نوکری کا امیدوار رہے۔ وقتاً فوقتاً بغرض فاقہ شکنی کے کچھ وصول ہو جایا کرے گا۔

یہ صورتیں اکلِ حلال کی ہیں۔ اب اگر حرام و حلال سے کوئی بحث نہ رکھتا ہو اور صورت ظاہری اچھی ہو۔ کسی مالدار عورت کے پھانسنے کی فکر کرے۔ عام اس سے کہ وہ شوہر دار ہو یا بیوہ۔ یہ بھی ناممکن ہو تو کسی نوعمر رئیس زادے کو قبضے میں لائے۔ اس حالت میں اگر ممکن ہو تو اپنی بہن یا لڑکی کا نکاح اس کے ساتھ کر دے یا کسی اور طریقہ سے اس کے تمام مال پر قبضہ کرے اور جب وہ

یک بینی و دو گوش ہو جائے تو اس سے کنارہ کشی کرے اور تنہا اس کی لیاقت نہ رکھتا ہو تو جعلیوں کی کمپنی میں شرکت کرے اور جو کچھ روپیہ پاس ہو تو جعلی مقدموں میں روپے سے مدد دے۔ روپیہ نہ ہو تو پیروی دوڑ دھوپ سے اپنا ایک حصہ مستقل کمپنی میں قائم کرے۔

یہ سب صورتیں ایسی ہیں کہ نظامِ معاشرت میں عزت باقی رہے اور روپیہ پیدا ہو، اور اگر کوئی خدانخواستہ کوئی پیشہ کر لیا یا کسی قسم کا ہنر سیکھ کے اس سے اخذِ معاش کرنے لگا تو لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل ہو جائے گا یہاں تک کہ لڑکے لڑکی کی شادی بیاہ میں دقتیں پیش آئیں گی۔ چھوٹی امت والوں میں شمار کر لیا جائے گا۔ خواہ وہ کیسا ہی شریف النسل اور شریف الذات کیوں نہ ہو۔ یہ امور جو یہاں لکھے گئے ہیں۔ اس کو ناظرین مذاق نہ سمجھیں۔ یہ بالکل واقعات ہیں۔

غرض کہ ہمارے مرزا صاحب کے عزیز مرزا فدا حسین اسی قسم کے لوگوں میں سے تھے جن کے ایسے خیالات ہوتے تھے اور اپنے خیالات کے بدولت یہ اور ان کے بال بچے طرح طرح کے مصائب میں مبتلا تھے۔

جس زمانہ میں مرزا صاحب ضلع میرٹھ میں اسسٹنٹ انجینیر تھے۔ مرزا فدا حسین بصیغۂ مرثیہ خوانی اسی ضلع میں ایک رئیس کے مکان پر تشریف گئے۔ مرزا صاحب بھی محرم کی مجلسوں میں وہاں جایا کرتے تھے۔ وہیں ملاقات ہوئی۔ مرزا فدا حسین کو بلحاظ قرابت ایک دن اپنے علاقہ پر مہمان کیا۔ دعوت کی۔ ایک روز خود اپنے مکان پر مجلس کر کے مرزا صاحب سے پڑھوایا۔ وقت روانگی مرزا صاحب کو رئیس کی سرکار سے پچیس روپے وصول ہوئے۔ مرزا فدا حسین کے افلاس کا حال کچھ پوشیدہ نہ تھا۔ مرزا عابد حسین نے ایک مجلس

کی پڑھوائی کے حیلے سے پچاس روپے اپنے پاس سے دیے۔ دوسرے سال پھر ایسا ہی اتفاق ہوا۔ اب کی مرتبہ مرزا فدا حسین نے کہا کہ اگر کوئی صورت روزگار کی ممکن ہو تو کر دیجیے۔ مرزا عابد حسین نے کہا کہ صورت روزگار کی ہو سکتی ہے بشرطیکہ محنت پر آمادہ ہوں۔ مرزا فدا حسین افلاس کے ہاتھوں بہت تنگ تھے منظور کر لیا۔ مرزا عابد حسین نے صاحب سے کہہ کے ایک جگہ محرری کی ان کو دلوا دی۔ پندرہ روپے ماہوار تنخواہ تھی۔ مرزا فدا حسین خوشی خوشی لکھنؤ گئے اور مع اہل و عیال مرزا عابد حسین کے علاقہ پر پہنچ گئے۔

مرزا عابد حسین نے ان کے اہل و عیال کو اپنے گھر میں اتار لیا۔

مرزا فدا حسین کی بیوی سکینہ بیگم بہت ہی تنگ مزاج تھیں۔ اس کے علاوہ لکھنؤ کے طرز معاشرت کی عادی۔ عادتیں بگڑی ہوئیں۔ صبح کے نو بجے سو کے اٹھنا۔ دن بھر فضول اوقات ضائع کرنا۔ ویسی ہی کچھ بچوں کی بھی خصلتیں تھیں۔ ان لوگوں کو کبھی باہر جانے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ ہر چیز باہر کی آپ کو بری معلوم ہوتی تھی۔ خواہ وہ درحقیقت بری ہو یا نہ ہو۔

مرزا فدا حسین کا خیال کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن ان کی بیوی یہ سمجھتی تھیں کہ مرزا عابد حسین نے جو ان کے میاں کو نوکر رکھوا دیا ہے اس میں کچھ ان ہی کا مطلب ہے۔

مرزا عابد حسین کی بیوی مہمان نوازی کے لحاظ سے جتنی ان کی خاطر داری کرتی تھیں وہ اس کو ایک قسم کی خوشامد اور مطلب برآری سمجھتی تھیں۔ یہ تو ایک قسم کی غلط فہمی تھی۔ اس کے علاوہ حسد نے اور بھی آنکھوں پر پردے ڈال دیے تھے۔ احسان فراموشی عیب ہے مگر وہ اپنے شوہر کو مرزا عابد حسین کا محسن تصور کرتی تھیں اور اسی قسم کے سلوک کی متوقع تھیں جو محسنوں کے ساتھ

کرنا چاہئے۔ سکینہ بیگم صاحبہ نے ایسے حلقۂ معاشرت میں پرورش پائی تھی جہاں بے غرضی سے کسی کے ساتھ نیکی کرنے کا مفہوم بالکل ناممکن خیال کیا جاتا تھا۔ ان کا یہ مقولہ تھا کہ "بے مطلب کسی کو کوئی کچھ نہیں دیتا۔"

مرزا فدا حسین کی بیوی یہ سمجھتی تھیں کہ مرزا عابد حسین اور ان کے خاندان نے ان کے شوہر اور خود ان پر وہ ظلم کیا ہے جس کی تلافی ردِ مظالم سے بھی ممکن نہیں۔ ایک تو لکھنؤ سے چھڑوانے کا گناہ اس قدر سنگین اور سخت تھا کہ اگر عدالت مرزا فدا حسین کی بیوی کے اختیار میں ہوتی تو مرزا عابد حسین اور ان کے بی بی بچوں کو کولھو میں پلوا ڈالتیں۔ اٹھتے بیٹھتے یہ کلام تھا۔ ہائے پندرہ روپلی کے لیے گھر چھوٹا، بار چھوٹا۔ موئے جنگلے میں آکے رہنا پڑا۔ کیوں بہن رقیہ بیگم (مرزا عابد حسین کی بیوی کا نام) میں کہتی ہوں اگر یہاں کوئی مر جائے تو کیا ہو؟ کھٹیا پر اٹھایا جائے گا۔ فاتحہ درود بھی اچھی طرح نہ ہو۔

تمہارے میاں کا خدا بھلا کرے کس جنگل میں لا کے ڈالا ہے جہاں اپنا کوئی عزیز نہ ساتھی۔ نہ پوچھنے والا، نہ دیکھنے والا۔ سب تو سب میری بتولی کو دوسرا سال بھر کے تیسرا سال شروع ہو گیا ہے۔ شہر میں دودھ بڑھائی کرتی۔ چار اپنے پرائے جمع ہوتے۔ نذر نیاز ہوتی۔ ذاکر (بڑے لڑکے کا نام تھا) کو پندرہواں سال ہے۔ ماشاءاللہ مسیں بھیگتی ہیں۔ اس کا سیل کونڈا کرنا ہے۔ اور تو خیر۔ بڑی مشکل یہ آن پڑی کہ ہر مزی (بڑی لڑکی کا نام ہے) کو نواں برس ہے۔ شہر میں ہوتے تو اس کی نسبت کا بندوبست کرتی۔ مشاطہ کو بلوا کے کہیں سے رقعہ منگواتی۔ میں کہتی ہوں کہ یہ ہونا کیا ہے۔ پھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔ باز آئے ہم اس پندرہ روپیہ کی نوکری سے۔ شہر کے چنے اچھے اور باہر کا پلاؤ نہیں اچھا۔

مرزا عابد حسین کی بیوی بہت ہی نیک اور نمو ہی تھیں مگر پندرہ روپے کا طعنہ اتنی بار دیا گیا کہ آخر کلیجہ پک گیا۔ ایک آدھ مرتبہ بولنا ہی پڑا۔ ان کا بولنا تھا کہ اچھی خاصی لڑائی ٹھن گئی۔ بی سکینہ بیگم آپ ہی آپ خفا ہو گئیں۔ بات چیت ترک کر دی۔ عادتیں اس خاندان کی بالکل بگڑی تھیں۔ سب سے بڑھ کر ایک خراب عادت سوا پہر دن چڑھے سو کے اٹھنا۔ نماز، دعا سے کوئی واقف ہی نہ تھا۔ مرزا عابد حسین کی بیوی منھ اندھیرے سو کے اٹھتی تھیں۔ اور اپنے ساتھ بیٹی بہو کو بھی اٹھا کے نماز پڑھواتی تھیں۔ اس کے بعد کلام اللہ کا ایک سپارہ پڑھا جاتا تھا۔ مامائیں۔ اصیلیں کھانا پکاتی تھیں۔ بیویاں یا کتابیں پڑھ رہی ہیں یا کچھ سی پرو رہی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ مرزا عابد حسین کی جفاکشی اور محنت پسندی کا تمام گھر پر اثر تھا۔ چھوٹا بڑا اس خاندان کا بیکاری کو گناہِ عظیم سمجھتا تھا۔ "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" یعنی اچھے کاموں کے کرنے کی ہدایت کرنا اور بری باتوں سے روکنا نہ صرف ایک فرضِ مذہبی ہے بلکہ انسان کی نیکی خود اسے کاموں کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اگر طبیعتیں برائیوں کی عادی نہ ہو جائیں اور ان میں تربیت پذیری کا جوہر موجود ہوتا ہے تو اصلاح ممکن ہے۔ جن طبیعتوں میں خراب عادتیں جڑ پکڑ لیتی ہیں تو ان میں بجائے تربیت پذیری کے ایک قسم کی ضد کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا دل بھی اپنی برائی کا معترف ہوتا ہے مگر اس کے ترک پر یا تو قدرت نہیں رکھتے یا اسے محال سمجھتے ہیں۔ اس لیے طبیعت ان حیلوں کو تلاش کرنے لگتی ہے جن سے نصیحت گروں کی زبان بندی کی جائے یا اگر اوروں کو نیکی کرتے ہوئے دیکھ کے خود اپنا نفس ملامت کرے تو اس میں جو ہر شریف کو (جو فی الحقیقت ایک فرشتہ ہے جو ہر حالت اور ہر وقت میں انسان کو نیکیوں کی ترغیب اور برائیوں سے منع کیا کرتا ہے اور جب

اس کا کہنا نہ مان کے انسان برائی کرتا ہے تو اس کو سخت ملامت کرتا ہے) دبا دینے بلکہ خاک میں ملا دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

مثلاً جب مرزا عابد حسین کی بیوی نے دیکھا کہ کئی وقت نماز کے گذر گئے اور مرزا فدا حسین کی بیوی نے نماز نہ پڑھی تو پہلے ان کو تعجب سا ہوا۔ دو ایک مرتبہ ارادہ کیا کہ کچھ کہیں لیکن لحاظ کے مارے کچھ نہ کہہ سکیں۔ آخر ایک دن مرزا فدا حسین کی بیوی کو علیحدہ لے جا کے اس طرح تمہید اٹھائی۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ بھابی مجھے ایک بات میں بڑا تعجب ہے مگر کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو کہوں۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ کہو۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ کہنا یہ ہے کہ میں نے آپ کو نماز پڑھتے نہیں دیکھا اور نہ لڑکوں کو۔ یہ آپ لوگ نماز کس وقت اور کہاں پڑھتے ہیں کہ مجھ کو خبر نہیں ہوتی۔ بھائی صاحب کی اذان اور نماز کی آواز اکثر آتی ہے۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ ہاں وہ پڑھتے ہیں شاید۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ ہائیں! یہ شاید کیسا اور کیا آپ نہیں پڑھتیں؟

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ رمضان اور محرم میں تو پانچوں وقت کی نماز پڑھتے ہیں اور یوں کبھی پڑھ لی اور کبھی نہ پڑھی۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ تو کیا فقط محرم اور رمضان میں نماز واجب ہے اور دنوں میں نہیں؟

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ اب یہ تو مولوی لوگ جانیں جو میں نے دیکھا تھا تم سے کہہ دیا۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ اچھا آپ کیوں نہیں پڑھتیں؟

مرزا فدا حسین کی بیوی :- یہ بھی ایک کم بختی کی مار ہے۔ بات اتنی ہے کہ میری طبیعت میں شبہہ کچھ اس قسم کا ہے کہ جہاں ذرا سی چھینٹ پڑ گئی یا کچھ ایسی بات ہو گئی۔ بس جی نہیں چاہتا نماز پڑھنے کو ؟

مرزا عابد حسین کی بیوی :- شبہہ تو آپ جانتی ہیں موئے شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔ شیطانی وسوسے کے خیال سے خدا کی نماز کا چھوڑنا کیسا ؟

مرزا فدا حسین کی بیوی :- اے ہے بھابی تم تو پڑھی لکھی ہو۔ تم سے دلیلیں کون ملائے۔ اچھا اب کی سے نہاؤں گی تو ضرور پڑھوں گی۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :- جان بوجھ کے ایک مرتبہ کی نماز قضا کرنے کا نہیں معلوم کتنا عذاب ہے اور آپ نے کہہ دیا کہ نہاؤں گی تو پڑھوں گی۔ ابھی پرسوں تو آپ نہائی تھیں۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :- اے ہے نہائی تو تھی پھر چھینٹ پڑ گئی۔ کپڑے غارت ہو گئے۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :- کہاں چھینٹ پڑ گئی۔ جہاں چھینٹ پڑ گئی ہو اس کو دھو کے غوطہ دے لیجیے۔ شوق سے نماز پڑھیے۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :- اب یہ کیا معلوم کہاں چھینٹ پڑ گئی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر کیا تھا۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :- تو معلوم ہوتا ہے آپ نے چھینٹ پڑتے دیکھا نہیں۔ اگر دیکھا ہوتا تو یہ ضرور معلوم ہوتا کہ کہاں پر چھینٹ پڑی۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :- ہاں تو میں خود ہی کہتی ہوں کہ شبہہ ہے۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :- شبہہ پر نماز ترک نہیں ہو سکتی۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :- خدا مارے یا جلائے۔ مجھ سے تو ہر ستے نہیں نہایا جاتا۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ آپ سے ہر سٹے نہانے کو کون کہتا ہے ۔ ہاں تو یہ کہیے کہ نہ پڑھی جائے گی ۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ کپڑے تو چھپا یا اور نماز پڑھ لوں ۔ ایسی نماز کے قربان۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ ہاں تو یہ کہیے کہ نماز نہ پڑھیے گا اور پھر جب آپ ہی نہ پڑھیں تو لڑکے بھلا کیوں پڑھنے لگے ۔

غرضکہ اس تقریر کے بعد مرزا عابد حسین کی بیوی کو مایوسی ہوگئی مرزا فدا حسین کی بیوی کو جہاں اور شکایتیں تھیں ان سب میں سے ایک یہ بہت بڑی شکایت تھی ۔

ہائے اس جنگل میں لائے ڈالا ہے جہاں کہیں اذان کی آواز نہیں آتی ۔ ماتم کی آواز نہیں آتی ۔ جہاں شام ہوئی اور گیدڑ بولنے لگے ۔

جس دن سے نماز کے باب میں گفتگو ہوئی تھی ۔ اذان کا ذکر اس شکایت سے حذف کر دیا گیا تھا ۔ مگر ماتم کی شکایت باقی تھی بلکہ اس دن سے ماتم کے لفظ پر زیادہ زور دے دیا گیا تھا ۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ جب انسان کی ایک برائی ثابت ہو جاتی ہے تو وہ اپنی بعض نیکیوں کو جو اس میں موجود ہوں ظاہر کرنے کی زیادہ کوشش کرتا ہے تاکہ اس کی برائی کی وجہ سے جو اس کی ذلت ہوئی ہے دوسری نیکی اس کا موازنہ کر دے ۔

ماتم کے بار بار تذکرے سے یہ مقصود تھا کہ اگرچہ ہم نماز کے پابند نہیں ہیں لیکن ماتم داری کا شوق ہمیں بہ نسبت اور لوگوں کے کم از کم مرزا عابد حسین کی بیوی سے زیادہ ہے ۔ مرزا عابد حسین کے گھر میں اگرچہ ماتم اور نوحہ خوانی کا ذکر نہ تھا مگر خدا کے فضل سے چھوٹے سے لے کے بڑا تک سب ایک مذہبی تاریخ سے واقف تھے ۔ پیغمبرؐ اور اہلبیتؑ کے نام پر جان و دل سے فدا تھے ۔ ذکر اہل بیت

کو عبادت سمجھتے تھے۔ مگر نہ اس طرح کہ جیسا مرزا فدا حسین کی بیوی کا خیال تھا۔ آٹھویں دن جمعرات کو سوا پیسے کی ریوڑیاں منگوا کے کھڑے ہو جانا اور دو بول رسید سے اپنے کسی دھن میں پڑھ لینا اور ماتم حسین کہہ کے سینہ کوبی کر لینا ان کے نزدیک چنداں واجبات سے نہ تھا۔ مرزا عابد حسین کا طریقہ دینداری عام لوگوں کے ایسا نہ تھا اور ان میں ایک صفت خداداد تھی کہ جس بات کو اچھا سمجھ لیتے تھے اس کو عمل میں لانے سے پہلے ان کو کسی سے حجاب نہ ہوتا تھا۔ عوام کی تقلید محض سے ان کو چڑھ تھی۔ یہی طریقہ آپ کے گھر بھر کا ہو گیا تھا۔

چند روز تک مرزا فدا حسین کی بیوی کی ان شکایتوں کا کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ آخر ایمان کی بات تھی کہاں تک سکوت کیا جاتا۔ ایک دن مرزا عابد حسین کی بیوی کو کہنا پڑا۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ تو کیا تم جمعرات کو ماتم کیا کرتی ہو ؟

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ ہاں بی بی سو کام دنیا کے کرتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی کام ایمان کا بھی تو کرنا چاہیے۔ آخر خدا کو بھی ایک دن منہ دکھانا ہے۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ مگر آپ نماز تو پڑھتی نہیں جو اصل کام ایمان کا ہے۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ اچھا نماز نہیں پڑھتے نہ سہی۔ ماتم تو آٹھویں روز کا ناغہ نہیں ہونے پاتا۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ ایسے ماتم سے کوئی فائدہ نہیں۔ جب نماز نہ پڑھی تو خالی ماتم سے کیا ہوتا ہے ؟

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ توبہ توبہ کرو۔ کفر نہ بکو۔ ماتم کو تم اس طرح کہتی ہو ؟

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ میں سچ کہتی ہوں۔ امام حسینؑ اس بات سے ہرگز راضی نہ ہوں گے کہ خدا کے فرض کو آپ ترک کر کے ان کا ماتم کیجیے۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ یہ تم نے کیا کہا۔ ماتم ایک پر ایک ہے۔
مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ مگر نماز ہزار پر ایک ہے۔ بغیر نماز کے ماتم کام نہ آئے گا۔
مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ بھابی باہر رہتے رہتے تمہارا ایمان درست نہیں رہا۔
اور ہاں میں نے ایک اور بات سنی ہے۔ تمہارے میاں! اے ہے موئے وہ کون کہلاتے ہیں۔ ہاں خوب یاد آیا۔ نیچری۔ تمہارے میاں تو نیچری ہیں۔ جانتی ہوں کہ تم نے بھی میاں کے ساتھ اپنا ایمان کھو دیا۔
جب تو تم ماتم کو اس طرح کہتی ہو۔ تم ایسا نہ کہو۔ آل اولاد والی ہو۔
مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ کیوں اس میں آل اولاد کو خدانخواستہ کیا ضرر ہے؟
مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ لو اتنا بھی تم نہیں سمجھتیں۔ آل اولاد کا ذلل (ضرر) تو ہوتا ہی ہے۔ خدا کوئی لاٹھی لے کے مارتا ہے۔ جب اس کی باتوں میں تم پخ نکالتی ہو۔ اس کی سزا کچھ نہ کچھ ہونا چاہیے۔ یا دیدوں گھٹنوں کے آگے آئے یا خدانخواستہ شیطان کے کان بہرے اولاد کے دشمنوں پر بن آئے۔ ہر جمعرات کو ماتم کیا کرتی تھی۔ شامت کی ماری تین جمعراتیں ناغہ ہو گئیں۔ بتولی ایسی ماندی ہو گئی کہ کسی طرح بچنے کی کوئی توقع نہ تھی۔ آخر مجھے خواب میں دکھایا کہ تو ہمارا ماتم کیا کرتی تھی۔ اسے تو نے ناغہ کیا۔ آخر پائی نہ اس کی سزا۔
دوسرے دن سے میں نے تین وقت ماتم کرنا شروع کر دیا۔ صبح، دوپہر، شام۔ لیجیے اسی دن سے میری لڑکی اچھی ہونے لگی۔
مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ بھابی توبہ کرو۔ امام حسین کو بھی تم لوگوں نے اپنا سا بنا لیا کہ ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جاتے ہیں۔
مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ یہ تو خفا ہونے کی بات ہی ہے۔ آپس میں دیکھ لو۔ یہ

خیال کرو کہ تم مجھ کو عید بقرعید حصہ بھیجتی ہو اور جو ناغہ کرو تو مجھ کو رنج ہوگا یا نہیں۔ بس یوں ہی سمجھ لو۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ آپ تو مجھ کو کہتی ہیں مگر معلوم ہوا کہ آپ ایمان کی باتیں بالکل نہیں جانتیں۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ سچ ہے اپنی ہائے اوروں پر گنوائی۔ جیسے تم میاں کی محبت میں خدا اور رسولؐ سب بھول گئیں۔ ویسا سب کو جانتی ہو۔ بس تمہارے ایمان کا حال تو معلوم ہوگیا کہ شیعہ مومن ہو کے تم ماتم کی کی کوئی اصل نہیں سمجھتیں۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ میں ماتم کی کوئی اصل سمجھتی ہوں یا نہیں۔ یہ میرا دل جانے اور میرا ایمان۔ مگر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ مسلمان ہو کے خدا کی نماز جو واجبات سے ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتیں۔ نہ خود پڑھتی ہیں نہ بچوں کو سکھاتی ہیں۔ ہم لوگ امام حسینؑ کے غم کو اتنا مانتے ہیں کہ روز بعد نماز اور کلام اللہ کے سجادی کے ابا حدیث پڑھتے ہیں یا اگر وہ باہر ہوتے ہیں تو میں خود پڑھتی ہوں۔ سب چھوٹے بڑے گھر کے سنتے ہیں جو باتیں خوش ہونے کی ہیں ان پر خوش ہوتی ہوں اور جو رنج کرنے کی باتیں ہیں ان پر رنج کرتی ہوں۔ جن باتوں کو انھوں نے منع کیا ہے ان سے بچتے ہیں اور جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے اسے حتی المقدور کرتے ہیں۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ ہم نے تو ایک دن بھی نہیں دیکھا۔

اس بات پر مرزا عابد حسین کی بیوی بے اختیار مسکرانے لگیں اور کہا۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ بھابی آپ کیوں کر دیکھتیں۔ آپ تو اس وقت سوتی

رہتی ہیں۔

"جو سویا اس نے کھویا"

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ (اس بات پر ذرا کھسیانی سی ہو گئیں) اے ہے تو ایک دن میں بھی سنوں گی۔ بھائی صاحب کیا پڑھتے ہیں۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ خیر وہ آج کل دورے پر ہیں۔ آپ سویرے اٹھیے میں آپ کو حدیث پڑھ کر سناؤں گی۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ ضرور کل ہی سہی۔

وعدہ تو کر لیا۔ مگر مرزا فدا حسین کی بیوی کو ایک دن بھی سویرے اٹھنا نصیب نہ ہوا کہ وہ حدیث سنتیں۔ مرزا فدا حسین کی بیوی میں ایک اور صفت تھی۔ بات بات میں گالی۔ خواہ ہنسی میں ہو۔ خواہ غصے میں۔ بچوں سے بات کرنے میں ہر ہر لفظ کے بعد ایک موٹی سی گالی ضرور شریک ہوگی۔ ہر مزی کی زبان بھی ماشاء اللہ خوب آراستہ تھی۔ چھوٹی لڑکی جو گود میں تھی اس کی زبان کھلنے لگی تھی۔ اس کو گالیاں تعلیم دی جاتی تھیں اور جو ایک آدھ لفظ اس معصوم بچے کی زبان سے نکل جاتا تھا تو اس سے بہت خوش ہوتی تھیں۔

صاحبزادے کا سن اب چودہ برس سے کچھ زائد تھا۔ جن کے سیل کے کونڈے کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ ضلع ۔ جگت پھبتی میں طاق تھے۔ ان کی شکایت سب سے بڑی یہ تھی کہ یہاں کنکوے کا کہیں ذکر نہ تھا اور بغیر کنکوا اڑائے آپ کیوں کر رہ سکتے تھے۔ آخر آپ نے یہ کارستانی کی کہ مرزا صاحب کے دفتر میں سے آپ نے ایک گڈی ٹریسنگ پیپر[1] کی اڑائی اور پیمایش کرنے

---

[1] ٹریسنگ پیپر ایک قسم کا باریک کاغذ ہوتا ہے جو عکس کشی کے کام آتا ہے۔

کرنے کی جھنڈیوں سے ایک جھنڈی کا بانس ان کی گوں کا تھا اس کو کاٹ کے کانپ ٹھڈے چھیلے کئی کنکوے تیار ہو گئے۔ ڈور کے لیے اماں کی بچکیں ستیا ناس کیں۔ خلاصہ یہ کے انھوں نے اپنے شغل کے لیے اچھا خاصہ سامان تیار کر لیا۔ پڑھنے لکھنے سے کوئی غرض نہ تھی۔

ایک دن آپ کنکوا اڑا رہے تھے۔ اتفاق سے کنکوا ٹوٹ کے ایک غریب کسان کے کھیت میں جا گرا۔ اس کھیت میں گیہوں بوئے ہوئے تھے۔ آپ بے تکلف کھیت میں گھس گئے اور غریب کسان کی محنت کے سرسبز کھیت کو پامال کرتے ہوئے کنکوا اٹھا لائے۔ دو ایک مرتبہ تو کسان چپ ہو رہا لیکن جب کئی مرتبہ ایسا اتفاق ہوا تو اس نے انجینیر صاحب (مرزا عابد حسین) سے نالش کی۔ مرزا صاحب کو تعجب ہوا کہ یہاں کنکوا کہاں سے آیا غرضکہ وہ کنکوا منگا کے دیکھا گیا۔ کاغذ مرزا صاحب نے پہچانا۔ نہایت ہی جز بز ہوئے۔ اہلِ دفتر پر سخت تاکید کی یہ صاحبزادے دفتر نہ جانے پائیں۔ اور ٹریسنگ پیپر اپنے پاس سے منگا کے دفتر میں داخل کیا۔

صاحبزادے میں ایک اور عادتِ بد تھی۔ انجینیر صاحب کے بنگلے کے قریب ایک سرکاری باغ تھا۔ اس کی نگرانی مرزا صاحب کے ذمے تھی۔ اس کا ٹھیکہ سال کے سال دیا جاتا تھا۔ خود مرزا صاحب کے گھر میں میوہ اور ترکاری بازار سے آتی تھی۔ یا اگر بضرورت اس باغ سے لیا گیا تو اس کے دام ٹھیکہ دار کو دیے جاتے تھے۔ صاحبزادے نے اس باغ سے نارنگیاں اور امرود کچے پکے بے تکلف توڑنا اور کھانا شروع کر دیے۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ میاں ذاکر نے اس چرائے ہوئے مال سے چار پانچ

نارنگیاں اور امرود اپنی اماں جان کو بھی دیے۔ انھوں نے بھی بغیر اس تحقیق اور تفتیش کے کہ یہ کہاں سے لاتا ہے، نوش کرنا شروع کر دیں۔ آخر اس کی بھی شکایت شدہ شدہ انجینیر صاحب کے گوش گزار ہوئی۔ یہ چوری کا معاملہ تھا۔ مرزا صاحب نے ذاکر کو بلا کر سخت تنبیہہ کی۔ اور مزید تنبیہہ کے لحاظ سے یہ بھی کہہ دیا کہ اگر اب کی ایسا ہوا تو میں تم کو تھانے پر بھیج دوں گا۔ یہ خبر میاں ذاکر کی ماں تک پہنچی۔ اے لیجیے قیامت آگئی۔ گویا کسی نے بھڑ کے چھتے کو چھیڑ دیا۔ کوئی کوسنا اور گالی باقی نہ رکھی۔ کئی دن تک بڑبڑایا کیں۔ ہے ہے تھانے پر بھیجنے والا غارت ہو۔ اے لو بچے نے دو نارنگیاں باغ سے توڑ لیں۔ اس پر بچہ تھانے پر بھیجا جاتا ہے۔ یہ عزیز داری ہے۔ سچ ہے اس وقت کے عزیز یزید ہوتے ہیں۔

آخر یہاں تک کہ مرزا عابد حسین کی بیوی کو بولنا پڑا۔ دھڑا دھڑی کی لڑائی ہوئی۔

مرزا عابد حسین کی بیوی بیچاری لڑنا جانتی ہی نہ تھیں مگر آخر انسان تھیں کوئی فرشتہ تو تھیں نہیں۔ جھوٹی اور بے تکی باتوں پر خواہ مخواہ غصہ آ ہی جاتا ہے۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ بھابی آپ بھی قیامت کرتی ہیں۔ یہ تو کچھ ایسی برا ماننے کی بات نہ تھی جس پر آپ بے قصور برا بھلا کہہ رہی ہیں۔ لڑکے نے سرکاری باغ سے نارنگیاں اور امرود چرائے۔ اس پر اگر انھوں نے تنبیہہ کے لیے کچھ کہا تو کیا بیجا کیا۔

مرزا آفتاب حسین کی بیوی :۔ بس اسی بات پر تو میرے دل میں آگ لگتی ہے۔ جب تم چوری کا نام لیتی ہو۔ چوری کیسی۔ چچا کا باغ کچھ

کے لڑکے نے دو پھل توڑ لیے تو اس میں کیا عیب ہو گیا۔ یوں روز دہیں سے پھل پھلاری آیا کرتی ہے۔ ماشاء اللہ گھر بھر کھاتا ہے تو کچھ نہیں۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ بس یہی تو آپ سمجھتی نہیں۔ ہمارے گھر میں جو کچھ آتا ہے مول آتا ہے۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ یہ تو ہم نے کہیں نہیں سنا۔ گھر کے باغ میں سے پھل پھلاری مول آتا ہے۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ تو کیا ہمارا باغ ہے ؟

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ پھر کس کا باغ ہے ؟

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ سرکاری باغ ہے۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ اچھا وہ سرکاری سہی۔ سرکار نے تو دیا ہے ترکاری کھانے کو۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ سرکار سے تنخواہ دی جاتی ہے۔ بھتہ دیا جاتا ہے۔ ترترکاری کھانے کو باغ نہیں دیے جاتے۔ اور دیے جائیں تو کہاں کہاں دیے جائیں۔ آج یہاں کل وہاں۔ روز تو بدلی ہوتی رہتی ہے۔ باغ پر کیا موقوف۔ لاکھوں روپئے کی جائیداد، مال سرکاری، ان کے حوالے رہتی ہے۔ اس کی جو کچھ آمدنی آئی وہ سرکار میں دی جاتی ہے۔ مثلاً یہی باغ ہے۔ اس کا ٹھیکہ سال کے سال ہو جاتا ہے۔ ٹھیکہ دار جو روپیہ دیتا ہے وہ سرکار میں چلا جاتا ہے۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ ہاں آدھے تہائی کا ہو گا۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ توبہ کرو! ہم لوگ سوائے تنخواہ اور بھتے کے

ایک حبہ کے گناہگار نہیں ہوتے۔ جس طرح ہماری تنخواہ مہینے مہینے سرکار سے ملتی ہے، اسی طرح ہم سرکاری مال کا دام دام سرکار کو دیتے ہیں اس میں ہمارا کیا حق ہے جو ہم لے لیں۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ اچھا تو کیا پھل پھلاری سے بھی گئے گذرے؟

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ ہماری کیا حقیقت ہے۔ بڑے انجینیر صاحب جب دورے پر آتے ہیں ان کے لیے جو میوہ ترکاری جاتا ہے اس کے دام ان سے وصول کر لیے جاتے ہیں اور وہ خوشی سے دیدیتے ہیں۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ یہ تو سب کہنے کی باتیں ہیں۔ بچے نے دو نارنگیاں توڑلیں اس پر طومار باندھا۔ ابھی بھائی صاحب یا میاں باقر دامرد توڑ لیتے تو ان کا ہاتھ کون پکڑ لیتا۔ اچھا وہ سرکار ہی کا باغ ہے پھر کیا سرکار ہر وقت دیکھا کرتی ہے۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ بھابی پھر وہی کہے جاتی ہیں۔ یہ سچ ہے۔ کوئی ہاتھ نہ پکڑ لیتا اور نہ کوئی ہر وقت دیکھتا رہتا ہے۔ مگر خدا دیکھتا ہے۔ یہ تو کھلی کھلی چوری ہے۔ بھلا ان کے دشمن کیوں چوری کرتے۔ کیا خدا نے ہمیں پیسہ نہیں دیا ہے جو ہم مول لے لیتے۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ یہ تو ہم نے یہیں آ کے سنا۔ لکڑی کے چور کی گردن نہیں ماری جاتی۔ پھل پھلاری اس لیے ہوتا ہے جس کے ہاتھ لگا اس نے توڑ لیا۔ اے لو ہمارے میکے میں خالہ ہمسائی کے گھر میں بیری کا درخت تھا۔ ہم اور ہماری بہنیں لڑکیاں لڑکیاں تھیں۔ خالہ ہمسائی دن بھر چلایا کرتی تھیں اور ہم لوگ دن دن بھر بیر جھوڑا کرتے تھے۔ ایک دن انھوں نے مجھے اسی بات پر کوسا تھا۔ دوپہر کو وہ تو سو گئیں

میں نے مارے ڈھیلوں کے بیری کا ستھراؤ کر دیا۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ آپ نے بڑا اچھا کام کیا۔ مگر وہ خالہ ہمسائی کی بیری تھی۔ وہ چیخ پیٹ کے چپ ہو رہی ہوں گی اور یہاں پانچ کیریوں کے لیئے اگلے سال ایک شخص کو دو مہینے کی قید ہو گئی۔ یہ سرکاری مال ہے۔ اسے کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ اچھا بیوی۔ اب تو ہم تمہارے بس میں ہیں چاہے قید کراؤ۔ چاہے پھانسی دلواؤ۔ تم یہاں کی حاکم ہو۔ جو جی چاہے کرو۔ ہم تو خطادار بندے ہیں۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ اچھا تو بس۔ اب اس ذکر کو جانے دیجیے۔ آپ کا ملال بڑھتا جاتا ہے اور جو اصل بات ہے وہ آپ سمجھتی نہیں اور بے فائدہ طعنے دیتی ہیں۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ طعنے کہنے کی تو میری عادت نہیں، اور سمجھ کو جو تم نے کہا۔ بے شک سمجھ تو میری الٹی ہے۔ سیدھی سمجھ تو آج کل کی چھوکریوں کی ہے اور ہزار بات کی ایک بات تو یہ ہے کہ سمجھ اسی کی ٹھیک ہوتی ہے جس کے پاس چار پیسے ہوتے ہیں۔ مفلسی میں آئی عقل جاتی رہتی ہے۔ اگر عقل ٹھیک ہوتی تو اس بڑھاپے میں اپنا شہر، گھر بار چھوڑ کے اس پردیس میں پرائے گھروں پر کیوں آ کے پڑتے اور لوگوں کی جوتیاں کیوں کھاتے۔

اس دل خراش تقریر کے ہر ہر لفظ نے بیچاری معصوم صفت مرزا عابد حسین کی بیوی کے دل پر نشتر کا کام کیا۔ مگر بیچاری نے صبر کیا اور کچھ جواب نہ دیا۔ مگر یہ قاعدہ ہے کہ جو لوگ کسی کا دل دکھانے کے لیے کچھ کہتے ہیں اور

جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے شخص پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوا تو انھیں اور غصہ آتا ہے۔ اس تقریر کے بعد مرزا فدا حسین کی بیوی منتظر تھیں کہ مرزا عابد حسین کی بیوی ضرور کچھ بولیں گی مگر وہ بیچاری لہو کے سے گھونٹ پی کے چپ ہو رہیں۔ اس پر مرزا فدا حسین کی بیوی کا غصہ اور بڑھا۔ اس موقع پر ایک اور ناشدنی واقعہ ہوا۔

مرزا عابد حسین کے ایک دوست نے ان کو کئی ٹوکرے امرود اور نارنگیوں کے اور اس کے ساتھ اور کئی قسم کا میوہ تھا۔ تحفے کے طور پر بھیجے تھے۔ مرزا صاحب نے محض اپنی سادہ دلی سے یا بطور تلافیِ مافات یا بطریق مہمان نوازی و دلجوئی وہ سب ٹوکرے بجنسہٖ مرزا فدا حسین کی بیوی کے پاس بھیج دیے۔ صورت واقعہ کی یہ ہوئی کہ جب یہ ٹوکرے میوے کے آئے۔ ذاکر مرزا صاحب کے پاس چپکا غریب بنا ہوا بیٹھا تھا۔ مرزا صاحب کے دل میں یہ خیال آیا کہ میں نے ذاکر کو جو اس دن تنبیہہ کی تھی ممکن ہے وہ کسی قدر ضرورت سے زیادہ ہو اس لیے کہ ذاکر کی ابھی اتنی عقل کہاں کہ وہ پرائیویٹ اور پبلک پراپرٹی (یعنی مال ذاتی اور مال سرکاری) کی حقیقت کو سمجھ سکے۔ ممکن ہے کہ اس نے میرا مال سمجھ کے میوہ توڑا ہو۔ اگرچہ اس دن کی چشم نمائی میری چنداں بیجا نہ تھی اور اس خیال کے ساتھ ہی ٹریسنگ پیپر اور کنکوے بنانے کا واقعہ یاد آیا اور پھر اس کسان کی فریاد، مگر ان سب امور سے قطع نظر کر کے آخری تنبیہہ کی سختی پر مرزا صاحب نے اپنی کریم النفسی سے اپنی ذات کو ملزم فرض کر لیا۔ ان کو کیا معلوم تھا کہ گھر میں ذاکر کی والدہ غصے میں بھری بیٹھی ہیں۔

جس وقت مرزا صاحب نے یہ ٹوکرے ذاکر کو عنایت کیے۔ اسی وقت ایک مختصر سا لکچر بھی دیا جس سے ذاکر کی تشفی اور تسلی کما حقہٗ ہو گئی۔ مرزا صاحب

کے لکچر کا مضمون غالبًا یہ ہوگا :۔

دیکھو بیٹا! اس دن جو ہم نے تم کو تنبیہہ کی تھی اس کا سبب یہ تھا کہ وہ باغ مال سرکاری ہے اور ہم اس کی حفاظت کے لیے مقرر ہیں اور اسی کی تنخواہ پاتے ہیں۔ یہ ہمیں ہرگز گوارا نہ ہوگا اور ضرور ہے کہ تم بھی اس کو پسند نہ کرو گے کہ جو چیز تمہارے سپرد کی جائے اس میں سے خود صرف کر دیا کسی اور کو صرف کرنے دو۔ آج یہ ٹوکرے میوے کے ہمارے ایک دوست نے ہم کو بھیجے ہیں یہ سب ٹوکرے ہم تم کو دیے دیتے ہیں۔ اب یہ مال تمہارا ہو گیا۔ اس میں سے جس قدر جی چاہے خود کھاؤ یا کسی کو دو تم کو اختیار ہے۔

یہ تسلی دینے والی تقریر اور پھر اس کے ساتھ میں ٹوکرے۔ ولایتی نارنگیوں اور بڑے امرودوں سے بھرے ہوئے ممکن نہ تھا کہ ذاکر کے دل میں کسی قسم کی آزردگی کا شائبہ بھی باقی رہتا۔

جب مرزا صاحب تقریر ختم کر چکے اور میاں ذاکر کو یقین ہو گیا کہ یہ سب کے سب ٹوکرے نارنگیوں اور امرودوں کے ان کا مال ہے پہلے تو یہ انداز کیا کہ ان کو کیونکر یہاں سے اٹھا لے جاؤں مگر یہ ان کی طاقت سے باہر تھا۔ پھر داہنے بائیں نظر کر کے دیکھا کہ کوئی ایسا آدمی ملے جو ان سب کو اٹھا کے میرے ساتھ لے چلے۔ اس وقت کوئی نظر نہ آیا۔ آخر ان کی عقل نے یہ فیصلہ کیا کہ ان میں سے تھوڑی نارنگیاں اور امرود ہاتھ میں اٹھا کے چلتے ہو۔ یہ خیال کر کے پھر یہ ٹوکرے تو کسی نہ کسی طرح گھر میں پہنچ ہی جائیں گے اور اگر پہنچے بھی تو وہاں جا کے حصہ رسدی بٹ جائیں گے۔ اس سے اپنا حصہ پہلے ہی کیوں نہ لے لو۔ انھوں نے سات آٹھ بڑی بڑی نارنگیاں اور چار پانچ امرود جیبوں میں بھر لیے اور کچھ ہاتھ میں لے کے گھر کی طرف روانہ ہوئے اور ایک نارنگی راستے

ہی میں چھیل ڈالی۔ جب یہ گھر کے اندر داخل ہوئے ہیں تو کئی پھانکیں اس کی نوش فرما چکے تھے۔ ان بیچارے کو کیا معلوم تھا کہ اماں جان غصے میں بھری بیٹھی ہیں۔ جوں ہی یہ گھر میں گئے اور ان کی اماں نے امرود اور نارنگیاں ان کے ہاتھ میں دیکھیں۔ آگ بگولہ ہو گئیں اور ذاکر کو منہ ہی منہ خوب کچلا۔ وہ بیچارہ کہتا رہا کہ ارے سنو تو۔ یہ مجھے چچا جان نے دیے ہیں۔ انھوں نے کچھ نہ سنا۔ برابر کچل رہی ہیں۔ آخر مرزا عابد حسین کی بیوی نے بڑی مشکلوں سے چھڑایا اور جس قدر نارنگیاں اور امرود ان کو ملے ان کو جوتیوں کے نیچے کچل کے مل ڈالا۔ ارے جائیں یہ نارنگیاں۔ غارت ہوں یہ نارنگیاں۔ کھانے والا مرے۔ کھانے والے کو ہیضہ کھائے۔ مُوا کیسا بھکر بھکر کھا رہا تھا۔ ابھی اس دن جوتیاں کھا چکا ہے۔ بید کھا چکا۔ قید فرنگ بھگت چکا۔ مُوا بے غیرت۔ پھر وہی نارنگیاں۔ وہی امرود۔ ایسے کھانے سے مُوئی بری چیز کھائی ہوتی۔

میاں ذاکر جو پٹ پٹا کے علیحدہ کھڑے ہوئے تو وہ اپنی ہانک بول رہے ہیں۔

واہ مجھے تو چچا جان نے تو دی تھیں۔ مجھے تو انھوں نے تین ٹوکرے امرود اور نارنگیوں کے دیے ہیں۔ سب باہر رکھے ہیں۔

مرزا عابد حسین کی بیوی بچے سب ان کی خصلت سے واقف تھے کہ جب وہ کسی بچے پر خفا ہوتے ہیں تو ضرور سے ہے کہ وہ دوسرے وقت اس کی دل جوئی کریں۔ وہ اصل روداد کو سمجھ گئیں۔ لیکن ذاکر کی ماں کا غصہ کسی طرح فرو نہیں ہوتا۔ کوسنے پر کوسنے اور گالیاں پر گالیاں دیے چلی جاتی ہیں۔ منہ کھول دیا ہے اور آنکھیں اور دونوں کان بند کر لیے ہیں۔

نہ کچھ دیکھتی ہیں نہ کچھ سنتی ہیں۔ اپنی زٹل ہانک رہی ہیں۔ جب اس چیخ چاخ اور گالی گلوچ اور کوسم کاٹے کو بہت دیر ہو گئی تو آخر مرزا عابد حسین کی بیوی کو بولنا پڑا۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ بھابی آپ خواہ مخواہ چیخ رہی ہیں۔ صریحاً ذاکر کہے جاتا ہے کہ مجھ کو چچا جان نے نارنگیاں دی ہیں۔ اور آپ بے فائدہ اس پر بھی خفا ہوتی ہیں اور ہم لوگوں کو بھی جو جی میں آتا ہے کہہ رہی ہیں۔ خیر ہم لوگوں کو جو چاہے کہیے۔ ہم تو کچھ نہیں کہہ سکتے۔ آپ بڑی ہیں۔ مگر بچے کو تو بے گناہ نہ کوسیے۔

مرزا فدا حسین کی بیوی اس کی راہ دیکھ رہی تھیں کہ کچھ بولیں تو لڑائی کے سلسلے کو اچھی طرح طول دوں۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ بیوی ہٹو۔ تمہارا اس میں کیا دخل ہے۔ ہم اپنے بچوں کو نصیحت کرتے ہیں۔ تمہیں کیا۔ تم کون؟

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ مگر قصور معاف کیجیے گا۔ یہ نصیحت تو بیجا ہے اس لیے کہ جب وہ کہے جاتا ہے کہ چچا نے مجھ کو تین ٹکڑے نارنگیوں اور امرودوں کے دیے ہیں تو اس نے قصور ہی کیا کیا ہے جس پر آپ نے بیکار اس کو مارا بھی اور اب کوس بھی رہی ہیں۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ بیوی ہٹو۔ انھوں نے لاکھ دی تھیں۔ اس نے کیوں لیں۔ اس دن کی گھڑکیاں بھول گیا۔ جیل خانے جانا بھول گیا۔ مُوا بے غیرت۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ یہ آپ بے کار کہتی ہیں۔ انھوں نے اس دن اپنا بچہ سمجھ کے تنبیہ کے لیے کچھ کہا تھا۔ اس پر اتنا برا مانا۔ آپ کو تو

اور خوش ہونا چاہیے کہ ہمارے بچے کو نصیحت کی۔ اور آج انھوں
نے اس خیال سے کہ شاید اس دن کی تنبیہ سے اس کو رنج ہوگا۔
کہیں سے میوے کے ٹوکرے آئے ہوں گے اس کو دے دیے۔
اس میں کون سی برائی کی؟

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ تم لوگوں کی وہ مثل ہے کہ سر پر جوتی اور منہ میں
روٹی۔ اس دن تو ذلیل کر دیا اور آج نارنگیاں دینے بیٹھے ہیں۔
موا بے غیرت تھا تا۔ اس نے خوشی خوشی لے لیں میں تو ایسی نارنگیوں کو
آگ لگا دیتی۔ بھلے آدمی کو ایک بات اور بھلے گھوڑے کو ایک چابک۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ ابھی اس دن آپ ہی کہہ رہی تھیں کہ میرے
دل میں بات نہیں رہتی مگر آج آپ کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ
آپ ذرا ذرا سی بات میں گرہ باندھ رکھتی ہیں۔ اچھا بس اب جانے دیجے

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ تو میں تمہیں کچھ کہتی ہوں۔ مگر اس موئے کا تو جب
تک ڈھائی چلو لہو نہ پی لوں گی مجھے چین نہ آئے گا۔ اس نے نارنگیاں
کیوں لیں۔ جن نارنگیوں کے کارن اتنی ذلت اٹھائی۔ جوتیاں
کھائیں۔ وہی نارنگیاں پھر کھانے لگا۔ موا کنگلا۔ بے غیرت یہ موا
ہے ہی بے غیرت۔ یہ کیا اس کا باوا بھی بے غیرت ہے۔ جب تو موا بڑھاپے
میں گھر بار چھوڑ کے پرائے ٹکڑوں پر آ کے پڑا ہوا ہے۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ افسوس میں لاکھ چاہتی ہوں کہ نہ بولوں۔ لیکن آپ
باتیں اس طرح کی کرتی ہیں کہ بے بولے رہا نہیں جاتا۔ پرائے ٹکڑوں
پر آ کے کیوں رہ گئے۔ نوکری میں کوئی عیب نہیں۔ ہم لوگوں کی مجال کیا ہے
جو کسی کو ٹکڑے کھلائیں گے اور دنیا کا کارخانہ اسی طرح چلتا ہے ایک

کے حیلے سے ایک کا فائدہ ہوتا ہے۔ بھائی صاحب نے نوکری کے
لئے کہا۔ یہاں ایک جگہ خالی تھی۔ انھوں نے نوکر رکھوا دیا۔ اس میں
تو کوئی برائی نہیں ہوئی۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ موئی نوکری میں نوکری بھی ہو۔ پندرہ روپئے کی نوکری
اس کے لیے تمام عمر کا احسان ہو گیا۔ وہ اپنے عزیزوں ہی کا سہی احسان
تو اٹھایا۔ عمر بھر کسی کے نمک کی ٹھیکری کے شرمندہ نہیں ہوئے، اس
بڑھاپے میں منہ کو کالک لگانا کیا فرض تھا۔ میں تو ان ہی کو کہتی ہوں
تم کو کچھ نہیں کہتی۔ اس میں تمہارا برا ماننا بے کار ہے۔

مرزا عابد حسین کی بیوی نے دیکھا کہ ان کی عقل ٹھیک نہیں ہے۔ نہ یہ
الٹی سمجھتی ہیں نہ سیدھی۔ ان سے حجت کرنا بے کار ہے۔ یہ وہاں سے اٹھنے
کے لیے بہانہ ڈھونڈھ رہی ہیں۔ اتنے میں باقر نے آواز دی۔ اماں جان
یہاں آئیے۔ یہ اٹھ گئیں۔ وہ نیک بخت ان کے اٹھ جانے کے بعد بھی بکتی
رہیں اور ذاکر تو موقع پا کے کھسک گیا تھا ورنہ نوبت ہی کو بہ کاری ہوتی۔

باقر مرزا عابد حسین کا بڑا لڑکا جو ابھی علی گڈھ کالج سے رمضان مبارک
کی تعطیل میں آیا ہوا تھا۔ اس کے کان اس قسم کی باتوں سے نا آشنا تھے
اس لیے کہ وہ اپنے اور اپنے وطنِ اصلی کے طرزِ معاشرت سے بالکل نا
واقف تھا اور اس لیے کہ جب سے اس نے ہوش سنبھالا مرزا صاحب باہر
رہے۔ گھر میں خدا کے فضل سے اس قسم کی گفتگو سنی نہ تھی۔ اس کی خصلتوں
میں شائستگی پورا اثر کر چکی تھی۔ کالج کی تعلیم اور تربیت نے مغربی نظامِ
اخلاق کا پہلا اصول ۔ "جیو اور جینے دو" عملی طریقوں سے اس کے دل
نشین کر دیا تھا اس طریقۂ تہذیب کا اسے ملکہ ہو گیا تھا جس میں یہ سکھایا

جاتا ہے کہ "دیانت بہترین مصلحت ہے" اس نے آنکھ کھول کر راست روی اور حق پسندی کی زندہ مثالیں یعنی اپنے والدین کو دیکھا۔ مدرسہ میں باہمی میل جول اور ہمدردی کے اکثر لکچر سنے۔ اپنے معلموں اور مدرسوں میں اکثر کو انسان کی بھلائی میں دل وجان سے کوشش کرتے ہوئے دیکھا۔ علم کی برکت سے حقوقِ والدین اور اس کے ساتھ ہی ان کے اعلیٰ درجے کے اخلاق کی عظمت اس کے دل میں سما گئی تھی۔ بغض وحسد، کفرانِ نعمت اور اس کے مثل گناہانِ کبیرہ یعنی وہ گناہ جو نظامِ معاشرت کو باطل اور کالعدم کرنے والے ہیں، اس سے اس کو ذاتی تنفر تھا۔ طعنے۔ تشنے، گالیاں، کوسنے، بکنا، بڑبڑانا، اور اسی قسم کی اور صفات سے وہ اجنبی تھا۔ اپنی ماں کے ساتھ ایک بے مغزی بدزبان اور بے تکی عورت کو الجھتے دیکھ کر اس کو انتہا درجہ کا طیش آیا۔ آخر اس نے اپنی ماں کو بلا کے اس واقعے کی اصلیت کو دریافت کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ سراسر قصور اسی عورت کا ہے اور والدہ اس معاملہ میں محض بے خطا ہیں جیسا کہ اس کو پہلے ہی یقین تھا۔ اس موقع پر باقر اور اس کی والدہ میں جو باتیں ہوئیں وہ لائقِ تحریر ہیں:۔

باقر:۔ میں نے اس سے پہلے کبھی اس قسم کی باتیں اپنے گھر میں نہیں سنیں۔ آپ کیوں بے کار اس کے ساتھ الجھتی ہیں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ آپ کی صحت کو اس سے سخت ضرر پہنچے گا۔

ماں:۔ کیا کروں بیٹا۔ جب سے یہ آئی ہیں ناک میں دم کر دیا ہے۔ نہ سیدھی سمجھتی ہیں نہ الٹی۔

باقر:۔ میں تو ہرگز جائز نہ رکھتا کہ ایسے لوگ گھر میں رہیں بلکہ والد سے اس باب میں عرض کروں گا کہ ان کو فوراً گھر سے نکال دیں۔

ماں :۔ تمہارے ابا خود پریشان ہیں مگر عزیزداری کا واسطہ ہے۔ کچھ بنائے بن نہیں پڑتی۔

باقر :۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ ہماری ہمدردی کی قدر نہ کریں، ان سے کسی قسم کا نیک سلوک کرنا اپنی نیکی کو ضائع کرنا ہے۔

ماں :۔ ہاں یہ سچ ہے مگر کیا کیا جائے۔ آخر ہمیں تو نیکی ہی کرنا چاہیے۔ اب اس پردیس میں ان کو کہاں نکال دیں ؟

باقر :۔ اماں جان میں اس دل کی نیکی کا اندازہ نہیں کر سکتا جس میں ایسی باتیں بھری ہوئی ہیں۔ جو آپ کے منہ سے نکلتی ہیں مگر میں نہایت ادب کے ساتھ آپ سے اختلاف کرتا ہوں کسی شخص کے حقوق سے زیادہ اس کی رعایت کرنا میرے نزدیک ایک طرح کی ناانصافی ہے۔ آپ میری رائے سے اتفاق کریں گی۔ مجھے ایک دن کے لیے ان کا گھر میں رہنا مناسب نہیں معلوم ہوتا اور اگر کسی مصلحت سے جس کو آپ سمجھتی ہوں، یا ابا جان، ان کا گھر میں رہنا ضروری سمجھیں تو ضرور ہے کہ میرے علیحدہ رہنے کا بندوبست کر دیا جائے۔ اگرچہ ان بیہودگیوں کا اثر آپ پر نہ پڑ سکے گا مگر خاندان کے لوگوں پر جو ابھی کمسن اور ناتجربہ کار ہیں اس کا بہت برا اثر پڑے گا۔

مرزا عابد حسین کی بیوی بات کے پہلو کو سمجھ گئیں۔ باقر حسین بہت دور کی بات کہتا ہے اور اس کی تقریر کا صاف منشا ہے کہ اگر یہ گھر میں رہیں گی تو میں ہرگز نہیں رہوں گا اور اپنے بیوی بچوں سمیت علیحدہ ہو جاؤں گا۔

باقر :۔ مجھے اس وجہ سے بھی ان کے ساتھ رہنا منظور نہیں کہ چار پانچ دن کا ذکر ہے کہ نادر کو یہ گود میں کھلا رہی تھیں، ایک بیہودہ بات زبان سے

نکالی جس کو سن کے میری آنکھیں نیچی ہو گئیں اور ان کو کسی قسم کی غیرت
نہ آئی۔ بچے جو باتیں بار بار کانوں سے سنتے ہیں اسی کو دہرانے لگتے
ہیں۔ میں ہرگز گوارا نہ کروں گا کہ نادر کی زبان گالیوں پر کھلے۔
ماں :۔ ہاں مجھے یاد آیا۔ یہ ان لوگوں کی پیار کی باتیں ہیں۔
باقر :۔ میں باز آیا ایسے پیار سے۔ میں تو یہ خیال کرتا ہوں کہ ان لوگوں کو گالیاں
دینے اور گالیاں سننے کی عادت ہو گئی ہے یہ لوگ بغیر اس کے رہ
نہیں سکتے۔ کوئی نہیں ہے تو معصوم بچے کو گالیاں دے رہے ہیں۔
آخر اس کا انجام یہ ہوگا کہ جب بچہ کی زبان کھلے گی تو وہ بھی گالیاں بکنے
لگے گا میرے کسی مہذب دوست کی گود میں اگر میرے لڑکے نے کوئی
گالی زبان سے نکالی تو مجھے نہایت ہی حجاب ہوگا۔
باقر کے وجوہات ایسے معقول اور مدلل تھے کہ ماں کو سوائے اس کے کہ
مقدمہ کو مرزا عابد حسین صاحب کے فیصلے پر محمول کریں کچھ کہتے نہ بن پڑا۔
شب کو جب مرزا صاحب کھانا کھانے کے لیے گھر میں تشریف لائے تو
کل واقعات من و عن ان سے بیان ہوئے۔ باقر کی رائے کو مرزا صاحب نے
بہت پسند کیا۔ دوسرے دن مرزا فدا حسین کو نوکری پر سے بلوا بھیجا نشیب و
فراز سمجھا کے اس امر پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے بیوی بچوں کو اس جگہ جہاں وہ متعین
تھے لے جائیں۔
مرزا فدا حسین کا جس جگہ تعین ہوا تھا وہ ہیڈ کوارٹر سے پچیس۲۵ میل کے
فاصلے پر تھا۔ اس جگہ پر ایک ڈاک بنگلہ تھا۔ اسی کے شاگرد پیشہ کے متصل
ایک چھوٹا سا سائبان محرّر کے رہنے کے لیے بنا ہوا تھا۔ مکان سے ملی ہوئی
چوکی دار کی کوٹھری تھی۔ تھوڑی دور کے فاصلے سے ایک بارک مزدوروں کے

رہنے کے لیے بنی ہوئی تھی۔

انجینیر صاحب نے مزید عنایت سے پچاس روپئے کی منظوری محرر کے مکان کی مرمت اور ضروری تبدیلیوں کے لیے کرکے تحویل سرکاری سے وہ روپیہ مرزا فدا حسین کو دلوایا۔

یہ ایک خاص قسم کی اعانت تھی جو مرزا صاحب نے اپنی نوکری کے زمانے میں بہت کم کی ہوگی۔ مرزا صاحب یہ روپیہ اپنے پاس سے ادا کرنے پر بڑی خوشی سے راضی ہوجاتے مگر سرکاری مکان تھا۔ اس میں کسی قسم کے ذاتی مصارف کے یہ مجاز نہ تھے۔

خلاصۂ تقریر یہ ہے کہ مرزا فدا حسین، بی بی، لڑکی اور لڑکا (یعنی میاں ذاکر) اس واقعے کے تیسرے چوتھے روز انجینیر صاحب کے بنگلے سے رخصت ہو کے ایک بیل گاڑی میں سوار ہو کے روانہ ہوئے۔

جس دن جانے کی تیاری ہو رہی تھی، اس دن مرزا فدا حسین کی بیوی نے صبح سے بکنا اور بڑبڑانا شروع کیا۔

۱۔ آخر میاں سے کہہ کے نکلوا دیا نا۔ اب دیکھیے کس جنگلے میں جا کے رہنا پڑتا ہے۔ شیر کھاتا ہے یا بھیڑیے کھاتے ہیں۔ اس بڑھاپے میں دیکھیے کیا لکھا پورا ہوتا ہے۔

۲۔ اے ہے لوگو۔ کیا بری عادت ہے۔ ذرا سی بات ہوئی اور پُھس سے میاں کے کان میں پھونک دی۔ جب آدمی ایک جگہ رہتا سہتا ہے تو لڑائی بھڑائی بھی ہوتی ہے۔ ایسی باتیں کوئی مَردوں کے منہ پر رکھتا ہے نکلوا دیا تو کیا ہوا؟ ہمیں پڑے رہنے بھر کو جگہ نہ ملے گی؟ آدمی اتنا بھی نہ اترائے۔ غرور خدا کو بھی پسند نہیں۔ کیا ہم مکان سر پر اٹھائے جاتے اور مکان بھی مُوافقت کا۔

انگریز کا بنوایا ہوا۔ کچھ کرایہ دینا پڑتا ہے۔ خیر کوئی خفا ہو جائے ہمارا خدا خفا نہ ہو۔ کوئی نہ کوئی جگہ رہنے کو مل ہی جائے گی۔ کیا مُردوں کو جگہ ہے زندوں کو نہیں۔ پردیس کا واسطہ۔ یہاں دو آدمی مل جل کے رہتے تھے۔ دکھ بیماری میں سب طرح آرام ملتا۔ مگر وہ تو بعضے لوگوں کو اکیلے رہنے کی عادت ہے۔ دو سے تیسرا آنکھ میں ٹھیکرا، ہے ہے کیا بری عادت ہے۔ ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جن کو چار آدمیوں کی آبادی نہیں اچھی لگتی۔ آدم بیزار۔

یہ سب باتیں مرزا عابد حسین کی بیوی اپنے کانوں سنتی رہیں مگر ایک کان گونگا کر لیا۔ ایک بہرا۔ خلاصہ یہ کہ مرزا فدا حسین کی بیوی سوار ہو گئیں۔ مرزا فدا حسین کو اس علیحدگی کا ضرور ملال ہوا۔ اس خیال سے کہ تنخواہ قلیل تھی۔ میاں کل اخراجات کے بارے سُبک دوش تھے۔ صرف اپنے دم کی فکر تھی۔ اب سارے گھر کا خرچہ اور وہی پندرہ روپئے۔ مگر ان مصلحتوں کو ان کی بیوی کیا سمجھتی تھیں اور اگر سمجھتی بھی تھیں تو ان کی زبان کب مانتی تھی۔

القصہ مرزا فدا حسین صاحب نے اپنے بیوی بچوں کو اس مکان میں اتارا۔ اس مکان کو دیکھ کے بیوی بہت گھبرائیں۔ ایک دن وہ تھا کہ انجینیر صاحب کے بنگلے کو یہ نام رکھتی تھیں۔ اے ہے یہ بھی کوئی مکان ہے جس میں انگنائی نہیں۔ کمروں میں گھٹے بیٹھے رہو۔ اس مکان میں چھوٹی سی انگنائی ضرور تھی، مگر نیچی چھتیں۔ تنگ مکان۔ دروازے سے جھانک کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوسوں تک کا جنگل تھا۔ بھلا شہر کے رہنے والوں خصوصاً عورتوں کا ایسی جگہ کیا دل لگتا۔ کچھ دن رہے گاڑی کھنچی تھی۔ سرِ شام تو بالکل ہی دم قلق کرنے لگا۔ رات کو تین بجے تک مارے خوف کے نیند نہ آئی۔

دوسرے دن زندگی کا سہارا اس طرح ہوا کہ چوکیدار کی جورو منشی جی کی

بیوی سے ملنے کو آئی۔ اس نے توب گھل مل کے باتیں کیں۔ سودے سُلف کا حال بھی اس سے دریافت کیا۔ یا یوں کہیے کہ آپ نے کہیں اس سے کہا کہ میرے پاس پان نہیں۔ ایک دو پیسے کے پان منگا دے معلوم ہوا کہ ایک گاؤں یہاں سے تین چار کوس کے فاصلے پر ہے۔ وہیں سے گیہوں، چاول، دالیں، نمک خرید کر کے آتا ہے۔ پان بھی وہیں ملتے ہیں۔ مگر بازار کے دن۔ گوشت اٹھوارے میں ایک مرتبہ ملتا ہے وہ بھی اگر آدمی وقت پر پہنچ جائے۔ نہیں تو بک جاتا ہے۔ اتنے میں مرزا فدا حسین باہر سے آئے۔ مکّا کی جورو گھونگھٹ سے منہ چھپائے باہر چلی گئی۔ مرزا صاحب اپنی بیوی کی بدعادتوں سے واقف تھے اور مرزا عابد حسین کے گھر سے نکلنے کا غصّہ ان کے دل میں بھرا ہوا تھا۔ مکّا کی جورو کو دیکھتے ہی اس دن کی تصویر صاف ان کی آنکھوں میں پھر گئی جس دن مکّا کی جورو سے پھکڑ ہوتی ہوگی مگر اس وقت انھوں نے چھیڑنا مناسب نہ جانا۔ بات دل میں لیے رہے۔ باہر جا کے دو ایک مرتبہ خیال آیا کہ مکّا کو سمجھا دیں کہ اپنی جورو کو گھر میں نہ جانے دے مگر کچھ کہتے سنتے نہ بن پڑا۔ آخر بات گئی گذری ہوئی۔

دوسرے دن مکان کی مرمت کے لیے مزدور لگائے۔ پردے کی وجہ سے سخت تکلیف ہوئی۔ ڈاک بنگلہ خالی پڑا تھا۔ بیوی بچوں کو چند روز کے لیے اسی میں اٹھا لے گئے۔ یہ بنگلہ بہت ستھرا اور ضروریات کے اسباب سے آراستہ تھا۔ بیچ کے ہال میں دری کا فرش تھا۔ درمیان میں ایک میز لگی تھی۔ چار پانچ کرسیاں رکھی تھیں۔ پہلو کے دونوں کمروں میں بہت ہی عمدہ نواڑی کے پلنگ لگے تھے۔ کنارے ایک میز لگی تھی۔ اس پر ایک صندوقچہ سنگاردان معہ آئینہ کے رکھا ہوا تھا۔ ایک

طشتری میں صابن رکھا تھا۔ میز کے خانے میں کئی سفید تولیے رکھے ہوئے تھے۔

مرزا فدا حسین کی بیوی یہ سامان دیکھ کے بہت خوش ہوئیں۔ میاں سے کہنے لگیں آخر جو تم وہاں گلیہ میں پڑے ہوئے ہو یہیں آن کے کیوں نہیں رہتے؟

مرزا فدا حسین :- یہ ہمارے رہنے کے لیے نہیں ہے۔ اس میں خود مرزا صاحب آ کے اترتے ہیں یا جب کوئی انگریز دورے پر آتا ہے تو وہ رہتا ہے۔

بیوی :- آج کل تو بالکل خالی پڑا ہے۔ بھائی صاحب جب دورے پر آئیں گے رات کی رات سو رہیں گے اور اگر دو ایک دن رہیں گے تو کیا حرج ہے۔ جب انگریز کوئی آنے والا ہو گا بنگلہ خالی کر دینا اسی گھر میں چلے جائیں گے۔ کوئی ہمیشہ تھوڑا ہی رہے گا۔ رات کی رات رہ کر چلا جائیگا۔

میاں :- یہاں تمہارا رہنا مناسب نہیں۔ جو مکان رہنے کے لیے دیا گیا ہے اسی میں رہنا چاہیے۔

بیوی :- تمہارے کہنے سے مناسب نہیں۔ اچھا خاصہ بنگلہ چھوڑ کے وہاں مرغیوں کی ڈھابلی میں جا کے رہیں۔

میاں :- مرغیوں کی ڈھابلی ہماری تقدیر میں ہو تو بنگلے میں ہم کیونکر رہ سکتے ہیں؟

بیوی :- تم رہو مرغیوں کی ڈھابلی میں۔ ہم تو یہیں رہیں گے۔ دیکھیں ہمیں کون نکال دیتا ہے۔ چھوٹے بھیا کا مزاج اس طرح کا نہیں۔ میں خوب جانتی ہوں۔ بیوی ان کی ہیں بس کی گانٹھ اور ایک وہ مواقلتہ باقر ٹھیک اپنی ماں پر پڑا ہے۔ نا صاحب! باپ اس طرح کا نہیں۔ اگر ان کا بس ہوتا

توکبھی ہم کو جدا نہ ہونے دیتے مگر ذرا نیک آدمی ہیں۔ بیوی سے ڈرتے ہیں۔ جتنے نیک آدمی ہیں وہ بیویوں سے ڈرتے ہیں۔ بیویوں کے کہے پر چلتے ہیں اور جتنے موئے بد مرد ہوتے ہیں وہ بیویوں پر جوتا تیز رکھتے ہیں۔ اس بارے میں چھوٹے بھیا کو ہرگز برا نہیں کہہ سکتی۔ جو چاہا چھوٹی بھابی نے کیا۔ ذرا چار پیسے ہو گئے تو کیا اتراتی ہیں۔ وہ دن بھول گئے جب دن بھر سوئیاں بھونکتی تھیں تو رات کو روٹی نصیب ہوتی تھی۔

سچ ہے اپنے دن کس کو یاد رہتے ہیں

میاں :۔ چھوٹی بھابی تو بس کی گانٹھ نہیں۔ یہ تمہاری زبان کہیں چین سے نہ رہنے دے گی۔ میں سب تمہاری حرکتیں سن چکا ہوں۔ بس اب ان باتوں کو جانے دو۔ تم نے مجھ کو کہیں کا نہ رکھا۔ چھوٹے بھیا نے جس وقت مجھ سے علیحدہ ہونے کو کہا ہے اس وقت ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

بیوی :۔ میں تو خود ہی کہتی ہوں کہ چھوٹے بھیا کا کوئی قصور نہیں۔ جو کیا باقر نے اور باقر کی ماں نے کیا۔

میاں :۔ باقر تو ایسا نیک لڑکا ہے کہ دنیا جہان کے ایسے لڑکے ہوں۔ ماشاءاللہ اس سن میں کیا لیاقت پیدا کی ہے۔

سامنے میاں ذاکر بغلوں میں ہاتھ دیئے کھڑے ہیں۔ ایک یہ مردود لونبڑا اتنا بڑا ہو گیا ہے اور بات کرنے کی تمیز نہیں۔ میاں ذاکر نے جو یہ دیکھا کہ ابا جان اماں سے لڑتے لڑتے اب میری طرف ڈھلے ہیں، چپکے سے باہر کھسک گئے۔

بیوی :۔ واہ بڑے لونبڑا کہنے والے۔ تم سے میں نے لاکھ دفعہ کہہ دیا کہ تم میرے بچوں کو ہولنسا مت کرو۔ جیسے انھوں نے پال پال کے بڑا کیا ہے۔ باقر کی

تعریفیں کرتے ہو۔ ذاکر میں کیا برائی ہے۔ پڑھنا لکھنا تقدیر سے۔ باقر پڑھا کیا ہے۔ وہی گٹ پٹ انگریزی کچھ پڑھا ہو مگر اتنے سن میں وہ غرور ہے کہ معاذ اللہ۔ یہ ساری باتیں ماں کی ہیں۔ بادا بچارے تو جب گھر میں آتے تھے، مجھے جھک جھک کے سلام کرتے تھے۔ صاحبزادے جو آئے تو نہ سلام علیک نہ کسی سے پوچھنا نہ گچھنا۔ ہاں۔ اماں کے کلیجے میں بیشک گھُسا رہتا ہے۔

میاں :۔ باقر کیا جانے تم کون بلا ہو۔ جو تمہیں سلام کرتا۔ بچپنے سے وہ باہر رہا۔ کسی عزیز کنبے کو اس نے دیکھا ہوتا تو وہ جانتا۔

بیوی :۔ اچھا۔ وہ ہیں تو بدزبان مگر تم اپنی زبان کو دیکھو (تم کون بلا ہو) تم خود بلا بھوت، پلیت ہو گے۔

میاں :۔ اچھا۔ وہ میں ہی سہی۔ میں نے تو ایک بات کہی۔ باقر تم کو کیا جانے؟

بیوی :۔ اچھا۔ اس سے کیا ہے تم باقر کی اور اس کی ماں کی غلامی کرو ہم نہیں کرتے۔

میاں :۔ اگر ہم اشراف ہیں تو ضرور باقر کی اور باقر کی ماں کی بلکہ ان کے گھر کے غلاموں تک کی غلامی کریں گے۔ چھوٹے بھیا نے تو ہمارے ساتھ وہ احسان کیا ہے کہ تمام عمر اس بار سے سر نہیں اٹھا سکتے۔ ایک تم بے احسانی ہو کہ چھوٹے بھیا کے بیوی بچوں سے جلتی ہو۔

بیوی :۔ موئی پندرہ روپلی کی نوکری کے لیے تم جوتیاں کھاؤ۔ اور کسی کو کیا غرض ہے۔ ہم تو یہ خیال کرتے ہیں کہ آخر عزیز کنبہ ہوتا کس لیے ہے؟ ایک سے ایک کا کام نکلتا ہے۔ دوسرے وہ ایسا احسان ہی کیا کیا۔ جس کے لیے تم بچھے جاتے ہو۔ یہی نا پندرہ روپلی کا نوکر کرا دیا پھر شہر چھڑا دیا۔ گھر چھڑوا دیا، بار چھڑوا دیا اور کچھ تنخواہ انھیں اپنی گرہ

سے دینی پڑتی ہے۔ سرکار میں ایک اسم لگا دیا ہے کچھ اپنے پاس
سے دیتے تو ایک بات تھی۔

میاں :۔ تم تو بے مغزی ہو۔ اپنے پاس سے جہاں تک مقدور تھا دیا پچاس
روپے نقد لکھنؤ جاتے وقت دیے تھے۔ یہاں اتنے دنوں سارے
گھر کا بوجھ بار اٹھایا اور کیا کوئی اپنا گھر لٹا دیتا ہے؟

بیوی :۔ تمہاری بھی کیا باتیں ہیں۔ کبھی کچھ کہتے ہو کبھی کچھ کہتے ہو۔ تم تو کہتے
تھے کہ وہ روپے پڑھوائی کے دیے تھے پھر اس کا احسان کیا؟

میاں :۔ لاحول ولا قوۃ۔ کیا عقل ہے۔ ارے پڑھوائی بھی کوئی حق ہے، دینے
کا ایک بہانہ تھا اور اگر پڑھوائی کے نام سے دیتے تو میں لیتا۔ بچوں
کے نام سے دیے تھے اس لیے لینا پڑا۔

بیوی :۔ اچھا تو اگر بچوں کے نام سے دیے تھے تو ایک دن کے تین سو ساٹھ دن
ہیں۔ ماشاءاللہ ان کے آگے بھی تو لڑکی ہے۔ جب لڑکی کی شادی ہوگی ہم
بھی ایک چالا کر دیں گے۔ خدا دے گا سو روپیہ کا جوڑا بہنا کے گھر بھیجیں گے۔

میاں :۔ لڑکی کے چالے کا کیوں ذکر کرتی ہو۔ یہ کیوں نہیں کہتیں کہ چھوٹے
بھیا کو سات پارچے کا خلعت دیں گے۔

بیوی :۔ اوہی۔ پھر کیا ہوا۔ وہ تم سے چھوٹے ہیں۔ اگر ان کو بھی کچھ دو گے تو کیا
انکار کر سکتے ہیں؟

میاں :۔ روٹی کھانے کو نصیب نہیں اور چھوٹے بھیا کو سات پارچے کا خلعت
دیں گے!

بیوی :۔ تو کیا خدا کو دیتے ہوئے دیر لگتی ہے؟

میاں :۔ تمہارے گن ہی ایسے ہیں کہ خدا تم کو دے گا۔

بیوی :۔ ہاں۔ پھر ہم تو برے ہیں۔ اچھا پھر اب کوئی اچھی سی ڈھونڈ لاؤ اور
اسے چھوٹی بھابی کی لونڈی گری میں دے دو۔
میاں :۔ اچھا۔ خلاصہ یہ کہ تم اس بنگلے میں نہیں رہنے پاؤ گی۔
بیوی :۔ پھر تم نے وہی بات نکالی۔ ہم تو تمہاری ضد سے یہیں رہیں گے۔
میاں :۔ تو تم اس طرح کی باتیں کرتی ہو جیسے تمہارے باپ کا مکان ہے یا میرے
باپ کا۔ ہم تو یہیں رہیں گے۔ کیا زبردستی ہے۔ جھوٹا پکڑ کے باہر نکال دی جاؤ گی۔
بیوی :۔ یہ تم ہنسی ہنسی میں باپ تک پہنچ جاتے ہو۔ تو انگریز ہمارے باپ ٹھہرے
اور جھوٹا پکڑ کے نکالی جائیں تمہاری اماں بہنیا۔ بس مجھ سے اس طرح
کے کلام نہ کرنا۔ نہیں تو اپنا منہ پیٹ لوں گی۔
میاں :۔ میں نے اپنے باپ کو بھی تو کہا۔ اس میں برا ناحق مانتی ہو اور میری
اماں بہنیا جب کسی کے گھر میں ڈھئی دیں گی تو ضرور نکالی جائیں گی بلکہ
جس طرح تم کہتی ہو اسی طرح۔ اور یہ دھمکی ہے کہ منہ پیٹ لوں گی۔ تمہارا
منہ دکھے گا میرا کیا نقصان ہے؟
میاں کی یہ تقریر سن کے بیوی ایسی کھسیانی ہوئیں کہ سچ مچ انھوں نے
دو چار طمانچے اپنے منہ پر لگائے اور چیخنا شروع کیا۔ مرزا فدا حسین تو ان حرکتوں
سے واقف تھے۔ ان کو کچھ زیادہ تعجب نہیں ہوا مگر باہر مکّا چوکیدار اور کئی مزدور
جو بنگلے کے پاس آم کے درخت کے نیچے چلم اڑا رہے تھے وہ کیا سمجھے کہ بنگلے
میں سانپ نکلا ہے۔ اپنے اپنے لٹھ سنبھال کے بنگلے کے برآمدے میں آکھڑے ہوئے۔
"منشی جی! کیا سرپ نکلا ہے۔ ذرا پردہ کر دیجیے"
مرزا فدا حسین نے سب کو بہ لطائف الحیل ٹال دیا۔
القصہ بیوی اپنی ضد کر کے اس بنگلے میں رہیں اور چار ہی دن میں بنگلے

کو حیثیت سے بے حیثیت کر دیا۔ جا بجا دیواروں پر پیک کے چھپکے، دری پر پتیلیوں کے پیندوں کی سیاہی کے نشان، تیل کے چکتے۔ دونوں پلنگوں کو لڑکوں نے کود کود کے دو ہی دن میں جھولا کر دیا، سنگار دان کا شیشہ چکنا چور کر دیا، دروازوں کے کئی شیشے توڑ ڈالے، فراشی پنکھا جو ہال میں لگا تھا اس کو بی ہُرمزی اور میاں ذاکر نے جھولا بنایا، ایک دن وہ پنکھا ٹوٹ کے گرا، دونوں کے سخت چوٹ آئی، کرسیوں میں تو شاید ہی کوئی ثابت بچی ہو، میزوں کی وارنش لبالب پانی کے کٹورے رکھنے سے جا بجا خراب ہو گئی، تولیے سب کے سب سالن بھرے ہاتھ پونچھ پونچھ کے فلیتے کر دیے۔ غرض کہ دس ہی بارہ دن میں ڈاک بنگلہ اور اس کے اسباب کو بالکل تہس نہس کر دیا۔ اسی زمانے میں بڑے انجینیر صاحب دورے پر آئے۔ اس ضرورت سے بنگلے کو جلدی جلدی خالی کرنا پڑا۔

صاحب نے آ کے بنگلہ کا جو یہ حال دیکھا، بہت ہی ناخوش ہوا۔ مرزا فدا حسین کو بلوا کے بہت کچھ سخت سُست کہا۔ دس روپئے جرمانہ کیے۔ اور مرزا عابد حسین صاحب کو ایک چھٹی ان کی شکایت کی لکھ بھیجی۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ:-

"محرر جو آپ نے نوکر رکھا ہے سخت نالائق ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے خاندان کو ڈاک بنگلے میں لا کے رکھا ہے۔ اس وجہ سے بنگلہ اور بنگلے کا اسباب بالکل خراب ہو گیا ہے۔ ہم نے فی الحال دس روپیہ جرمانہ منشی پر کیا اور آئندہ اگر اس قسم کا قصور اس سے سرزد ہو گا تو اس کو موقوف کر دیں گے۔ اطلاعاً آپ کو تحریر کیا گیا"

مرزا عابد حسین کو اس چھٹی کے دیکھنے سے جس قدر ملال ہوا اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔

اس واقعہ کے بعد میاں بیوی میں قیامت کی جنگ ہوئی مگر اس تفصیل

کو بہ لحاظ طول قلم انداز کرتے ہیں۔

مکا کی جورو سے گھر کے کام کاج میں بہت مدد ملتی تھی۔ آٹا بھی وہی پیس دیتی تھی۔ اس کا شوہر مکا سودا سلف لا دیتا تھا مگر اس سے بھی آخر ایک دن خوب جھگڑ ہوئی۔ مکا نے اپنی جورو کو ان کے گھر میں آنے جانے کو منع کر دیا۔

اس اثناء میں محرم قریب آگیا تھا۔ محرم سے پہلے مرزا فدا حسین نے عوضی دے کے ایک مہینہ کی رخصت لی۔ بیوی بچوں کو گھر پہنچایا۔ آپ جہاں پڑھوائی پر جاتے تھے وہاں گئے اور وہاں سے پلٹ کر کے پھر اپنی نوکری پر واپس آئے۔ اس کے بعد مرزا فدا حسین ایک عرصہ تک ملازم رہے مگر بیوی بچوں کو بلانے کا نام نہ لیا اگرچہ طرح طرح کی تکلیفیں تھیں مگر یہ سب انھوں نے گوارا کیں۔ سختی جھیل گئے۔ آدمی کارگر ثابت ہوئے اس لیے وقتاً فوقتاً ترقی ہوتی رہی۔ آخر پچاس روپے کے سب اُوَرسیر ہو گئے۔

ذاکر کو ہونہار دیکھ کر مرزا صاحب نے رکھ لیا تھا۔ لڑکا تربیت پذیر تھا۔ چند روز کے بعد کچھ تھوڑا پڑھ لکھ کے ٹھیکہ داری کا کام کرنے لگا۔ جوان ہوتے ہوتے بہت سا روپیہ کمایا۔ مرزا صاحب کی صحبت کی برکت سے اگرچہ یہ خاندان بہت ہی تباہ تھا مگر بالآخر کچھ نہ کچھ درستی حال ہو ہی گئی۔

جس زمانہ میں مرزا صاحب پر مقدمہ قائم ہوا تھا، مرزا فدا حسین نے حق قرابت خوب ادا کیا۔ بیچارے زمین کے گز بن گئے تھے۔ اس خوش سلیقگی سے پیروی کی کہ آخر مرزا صاحب فتح یاب ہوئے اور مفسدوں کو جیل خانہ ہو گیا۔

مرزا عابد حسین صاحب جب اودھ کے ایک ضلع میں پہلے پہل ملازم ہو کے گئے۔ سرا میں اترے۔ صاحب سے ملاقات کی۔ کارِ سرکاری سپرد ہوا۔ اس عرصے میں اس بستی کے بہت سے لوگ ان کو پہچاننے لگے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ چھوٹی بستیوں میں بہ نسبت بڑے شہروں کے بہت جلد شہرت ہو جاتی ہے۔ دو ایک صاحب شریف صورت اس بستی کے رہنے والے جو اپنے ذاتی منافع کے باب میں بڑے خوش فکر اور دور اندیش ہوتے ہیں، ان سے سرا میں آکے ملے۔ ایسے لوگوں کو خواہ مخواہ فکریں رہتی ہیں کہ فلاں عہدے پر کون مقرر ہوا؟ کس کی تبدیلی ہوئی؟ کس کی ترقی ہوئی؟ کس کا تنزل ہوا۔ غرضکہ یہ لوگ زندہ گزٹ ہوتے ہیں اور لطف یہ کہ نہ کہیں نوکر نہ چاکر نہ کوئی ذاتی معاملہ نہ مقدمہ۔ مگر ان باتوں سے بڑے بڑے مطلب نکال لیتے ہیں۔ حکام رسی، اہل عملہ سے حسب حیثیت رسم و راہ۔ یہ خالص اوصاف ہیں جو منجملۂ فضائل سمجھے جاتے ہیں۔

مرزا صاحب سے جو لوگ آکے ملے۔ ان میں سے ایک صاحب فدوی میاں خاندانی رئیس اس بستی کے تھے مگر بہ شرف انقلابِ روزگار یا مورو ثی غفلت اور اسراف یا خود ان کی اولوالعزمی یا شرکار کے تنازع قانونی یا کارندوں کی چالاکی کی وجہ سے اب صرف اضافی رہ گیا تھا۔ اگرچہ زمانۂ ماسبق میں ایک بزرگ زمیندار تھے۔ مگر اب صرف برائے نام ایک موضع کا نمبر آپ کے نام سے رہ گیا تھا۔ اگرچہ اس پر بھی تصرف مالکانہ ان کے ایک کارندہ مسمی شیو رتن کا تھا جو کہ درحقیقت اسی گھر کا ساختہ پرداختہ تھا۔ مگر اب خود ان سے بدرجہا متموّل اور ان کی کل موروثی جائداد کا اصلی مالک تھا مگر بہ لحاظ اخلاق ظاہری جو کہ اکثر کسی مصلحت پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ بھی ابھی تک

ان سے بدرا عات پیش آتا تھا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ موضع سہجن پور جہاں کا وہ
اصلی باشندہ تھا اسی کے یہ برائے نام نمبردار تھے۔ تحصیل وصول شیورتن کے
پاس تھی۔ مگر رعایا ابھی تک انھیں کا رعب و داب مانتی تھی اور اسامیوں سے
دبا کے کبھی کبھی کچھ انھیں بھی وصول ہو جایا کرتا تھا۔ ایک اور وجہ شیورتن
کی ان سے دبنے کی یہ تھی کہ شیورتن ایک چھوٹے درجہ کا آدمی تھا اور بستی
کے لوگ بسبب ان کی قدیمی ریاست کے اِن کو مانتے تھے اور اسی خصوصیت
کے لحاظ سے حکام اور اہل عملہ تک ان کی رسائی بہ سہولت ہو سکتی تھی۔
شیورتن کو ان سے بہت مدد ملتی تھی۔ اس لیے کہ اکثر مقدمات میں سعی سفارش
کہنا سننا جو کچھ ہوتا تھا وہ ان ہی کے ذریعے سے ہوتا تھا۔ یہ دوا دوش،
تملّق و چاپلوسی جو اکثر موقعوں پر کرنا پڑتی تھی۔ اس کا تمام فائدہ شیورتن
کو حاصل ہوتا تھا۔ آپ کا منشاء صرف اس قدر تھا کہ لوگ یہ سمجھیں کہ
فدوی علاقہ دار ہے اور فدوی کے قبضے میں ابھی کل مواضع ہیں۔ اور
شیورتن صرف ایک کارندہ ہے۔ صرف اس قدر تفاخر کے تحفظ کے
واسطے آپ ہر طرح کی مشقتیں اور صعوبتیں گوارہ کرتے تھے۔ بستی میں جس
قدر مکانات آپ کے بزرگوں کے تھے وہ اب شیورتن کے قبضے میں تھے
اور ان میں اکثر اہلِ عملہ رہا کرتے تھے۔ اس کا کرایہ شیورتن ماہ بہ ماہ وصول
کر لیتا تھا۔ ازبسکہ کرایہ لینا آپ اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ لہٰذا اگر کبھی
اس کا ذکر کسی موقع پر آیا تو آپ اس سے تحاشی فرماتے تھے۔ اور شیورتن کو
غائبانہ کلمات ناملائم سے یاد فرماتے۔

اسم مبارک آپ کا فدا علی تھا۔ مگر اس نام سے بہت کم لوگ واقف
تھے۔ لوگ آپ کو اکثر فدوی میاں کے نام سے جانتے تھے۔ آپ کا خود یہ

بیان تھا کہ فدوی تخلص ہے۔ مگر اصل وجہ یہ تھی کہ ابتدائے سال میں آپ اس لفظ کو اپنی نسبت بہت استعمال فرماتے تھے۔ مثلاً "فدوی حاضر ہوا تھا" اور "فدوی غائب ہوا" اور "عرض فدوی کی یہ ہے" اور "فدوی آپ کا قدیمی نیاز مند ہے" اس لفظ کے کثرتِ استعمال کی وجہ سے لوگوں نے آپ کا نام فدوی میاں رکھ لیا۔ پہلے غائبانہ اور پھر بالمشافہ اسی اسم سے موسوم ہوگئے۔ آپ نے مصلحتاً یہی تخلص اپنا قرار دے لیا۔ کیونکہ آپ کے تخلص کی (جواب کسی کو یاد بھی نہ تھا) شہرت نہ ہونے پائی کہ یہ لقب مشہور ہوگیا۔ اسی حالت میں اس تخلص کو بٹہ کھاتے میں ڈال کر دمِ نقد یہ تخلص اختیار کرلینا عین مصلحت تھی۔

مرزا عابد حسین کے تقرر کی خبر ضلع میں ان کے آنے سے پہلے آپ کو مل گئی تھی۔ جس دن آپ تشریف لائے اس کے دوسرے ہی دن آپ سرا میں پہنچ گئے۔ پھر ملاقات کرلینا کتنی بڑی بات تھی۔

مرزا صاحب چار بجے کے بعد سرا میں آکے ابھی بیٹھے ہی تھے کہ آپ نازل ہوئے اور بھٹیاری سے دریافت کرکے بے تکلف مرزا صاحب کے پاس چلے آئے۔

فدوی :۔ فدوی آداب عرض کرتا ہے۔

مرزا صاحب :۔ تسلیم !

مرزا صاحب بہت دیر آشنا تھے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وضعِ تہذیب کے پابند نہ ہوں۔ جب ایک شریف صورت اس طرح تعارف کرے تو اس سے بے رخی کیوں کریں۔

"آئیے تشریف لائیے"۔

اس وقت اتفاق سے بھٹیارہ اس طرف کسی ضرورت سے آنکلا۔

اس نے کہا "فدوی میاں سلام" اسی طرح آپ کو کئی شخصوں نے سلام کیا چلئیے نام بتانے کی بھی ضرورت نہ ہوئی۔ مرزا صاحب نے ازراہِ احتیاط اسمِ مبارک دریافت کیا۔

فدوی میاں :۔ بس یہی "فدوی"

مرزا صاحب :۔ (کسی قدر تعجب سے) دُرست!

فدوی میاں :۔ جی ہاں۔ وہ اصل حقیقت یہ ہے کہ نام تو میر افدا علی ہے۔ مگر فدوی تخلص ہے۔ یہی زبان زدِ ہر کس و ناکس ہو گیا۔

مرزا صاحب :۔ بہت مبارک!

فدوی میاں :۔ آپ کی تشریف آوری کی خبر سن کے میں بہت مشتاق تھا کہ آپ سے ملوں۔ اس لیے کہ یہاں حکام اور اہل عملہ میں کوئی صاحب ایسے نہیں ہیں جو فدوی کو نہ جانتے ہوں۔

مرزا صاحب :۔ میں جانتا ہوں کہ اکثر صاحبوں کو اس قسم کا شوق ہوتا ہے۔

فدوی میاں :۔ جی ہاں، شوق کیا ایک لت سی ہو گئی ہے۔ آپ جانیے یار باشی میں تو وہ مزہ ہے کہ جہاں اس کا چسکا پڑا پھر نہیں چھوٹتا۔

مرزا صاحب :۔ صحیح ہے جس کو جس بات کا شوق ہو جائے۔ اگر اس میں تضیع اوقات بھی ہو مگر انسان سے بمشکل ترک ہو سکتا ہے۔

مرزا صاحب کے ان بلیغ فقروں کا مطلب یا تو فدوی میاں سمجھے نہیں یا سمجھ بوجھ کے تجاہل عارفانہ فرمایا۔ اس لیے کہ مرزا صاحب تو کچھ ایسے کُھرّے تھے بھی نہیں۔ آپ تو ایسے ایسے حکام اور اہل کاروں سے مل چکے تھے جو رُکھائی میں شہرۂ آفاق تھے اور فدوی کو اس بات کا فخر تھا کہ مرزا صاحب کیا چیز تھے۔ جیمس صاحب جو بیہودہ ملاقاتوں سے اس

قدر نافر اور رعب تھے کہ جو کوئی بلا وجہ ان کی ملاقات کو جاتا تھا، ڈنڈا
لے کے پیچھے دوڑتے تھے۔ ان سے بھی فدوی میاں مل چکے تھے اور جب
تک وہ اس ضلع میں رہے برابر ہر دوشنبہ کو سلام کے لیے جایا کیے
علیٰ ہذا القیاس ڈپٹی تہور حسین خاں صاحب جنھوں نے اپنے بنگلے پر تختی لکھ
کے لگادی تھی کہ کوئی میری ملاقات کو نہ آئے۔ وہاں بھی فدوی پہنچ گئے۔
اور آخر اس قدر رسم بہم پہنچایا کہ ان کا پیچوان پیا۔ ان کے خاصدان
سے پان کھایا۔

فدوی میاں :۔ (مرزا عابد حسین سے) یہاں سرا میں تو آپ کو تکلیف ہوگی؟
مرزا صاحب :۔ جی ہاں۔ ابھی کل تو آیا ہوں مکان تلاش کر کے اٹھ جاؤں گا۔
فدوی میاں :۔ فدوی کے مکانات لاتعداد لاتحصیٰ ہیں۔ خالی پڑے ہیں۔
جو پسند آئے اس میں اٹھ چلیے۔
مرزا صاحب :۔ (کسی قدر تامل کے بعد) کس کرائے کے مکانات ہوں گے؟
فدوی میاں :۔ (مسکرا کے) آپ کو معلوم نہیں۔ دیہات میں اس
بات کا عیب ہے۔
مرزا صاحب :۔ مگر میں اس کو معیوب سمجھتا ہوں کہ بلا کرایہ کسی کے مکان
پر رہوں۔
فدوی میاں :۔ مگر جب کسی غیر کا مکان ہونا۔ مرزا صاحب اس کا جواب
دینے ہی کو تھے کہ میری آپ کی کب کی شناسائی ہے۔ مگر اسی اثناء
میں ان سے ایک اور صاحب ملنے کو آ گئے۔

پنڈت جانکی پرشاد صاحب ان کے ہم مکتب دوست جو اس
ضلع میں تھا نیدار تھے۔ مرزا صاحب ان سے مخاطب ہو گئے۔ فدوی میاں

ے ان سے حسب معمول بے تکلفی کی ملاقات تھی۔ بلکہ کچھ مذاق بھی فیمابین ہوتا تھا۔ مکان کا تذکرہ پنڈت صاحب کے سامنے بھی ہوا۔ پنڈت صاحب نے بھی یہی کہا کہ فدوی میاں کے کئی مکان خالی ہیں کوئی ان میں سے پسند کرکے اٹھ جائیے۔ ایک عہدے دار پولیس کے کہنے سے مرزا عابد حسین کو یہ تو اطمینان ہوا کہ فدوی میاں قابلِ اعتماد شخص ہیں۔

مرزا صاحب :۔ مگر آپ فرماتے ہیں کہ میں کرایہ نہ لوں گا۔

پنڈت صاحب :۔ اچھا اٹھ جائیے۔ حسابِ دوستاں دردل کا معاملہ ہو جائے گا۔

مرزا صاحب اس معمے کو نہ سمجھے۔ مگر چپ ہو رہے۔ اس اثناء میں فدوی میاں کسی ضرورت سے اٹھ گئے۔

پنڈت صاحب نے اصل حقیقت مرزا صاحب کے ذہن نشین کردی۔ علوم ہوا کہ مکان کا اصل مالک شیورتن ہے۔ وہ آپ کے گھر کا کارندہ تھا اس لیے آپ اس کو مال مملوک سمجھ کے اپنا مال سمجھتے ہیں۔

مرزا عابد حسین :۔ مگر یہ تو کہیے کہ یہ حضرت میرے اوقات میں تو ہارج نہ ہوں گے۔ کیوں کہ آپ جانتے ہیں میں اس قسم کی ملاقاتوں سے گھبراتا ہوں۔

پنڈت صاحب :۔ کچھ ایسے ہارج نہ ہوں گے۔ مکان میرے دیکھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے بڑا مکان جو آج کل خالی ہے، اس میں پہلے تحصیلدار صاحب رہتے تھے، آپ کی قسمت سے ان کی تبدیلی ہوگئی۔ فوراً لے لیجیے نہیں تو کوئی نہ کوئی لے لے گا اور آپ کو افسوس ہوگا۔ ان کے ہارج ہونے کی یہ صورت ہے کہ اس قسم کے لوگ جو بہت

لوگوں سے ملتے رہتے ہیں وہ کسی قدر مزاج شناس ہو جاتے ہیں۔ وہ آئیں گے ضرور خواہ ان کے مکان میں رہیے خواہ نہ رہیے۔ مگر جب آپ منہ نہ لگائیں گے دو چار منٹ ٹھہر کے چلے جایا کریں گے۔ آپ کا ہرج ہی کیا ہوگا۔ دوسرے ایک فائدہ بھی ہوتا ہے وہ یہ کہ جس چیز کی ضرورت ہو (مسکرا کے) خواہ کیسی ہی ضرورت کیوں نہ ہو، یہ مہیا کر دیتے ہیں اور لطف یہ کہ بکفایت۔ مرزا صاحب پنڈت جی کے اس موقع پر مسکرانے سے کسی قدر بدظن ہو گئے تھے۔ مگر پنڈت جی نے اپنی تقریر کو اس طرح جاری رکھا۔

پنڈت جی :۔ مثلاً اب حال فی الحال تو آپ کو گھوڑے کی ضرورت ہوگی۔ وہ آپ کی معرفت بہت جلد اور کفایت سے مل سکے گا۔ ماہواری غلہ، گڑ، گھی، راب جس شئے کی ضرورت ہوگی ان کی معرفت مل جایا کرے گی۔ اسباب ضروری مثل پلنگ، میز، کرسیاں، دریاں برتن، باسن، یہ سب ان ہی سے منگوائیے گا۔

مرزا صاحب :۔ مگر ان سب کا معاوضہ کیا دینا ہوگا؟

پنڈت صاحب :۔ کوئی معاوضہ نہیں۔ صرف وہی چند منٹ ہرج اوقات جو ان کے آنے سے ہوگا۔ یا اگر کچھ کمیشن وغیرہ لیتے ہوں تو اس کا علم نہیں۔

مرزا صاحب :۔ اچھا۔ اگر کمیشن لے کے عمدہ شئے بہم پہنچا دیتے ہیں تو یہ کچھ ایسا معیوب نہیں۔

پنڈت جی :۔ ہاں بس یہی سمجھ لیجیے۔ میرا جہاں تک خیال ہے آپ کو ان کی ذات سے کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا۔ ممکن ہے کہ کچھ فائدہ

ہو جائے۔

مرزا صاحب :۔ باہمی فائدہ رسانی تمدن کا اصل اصول ہے۔ اس کا میں منکر نہیں ہوں۔ مگر وہ معاملات جن میں طرفین سے غیر کافی معاوضہ پر کوئی شئے ایک سے دوسرے کی طرف منتقل کی جائے یا کوئی کام کیا جائے۔ اس کو میں ناجائز سمجھتا ہوں۔

پنڈت جی :۔ یہ دقیق منطق تو میری فہم سے باہر ہے۔ میرے کہنے کا خلاصہ یہ ہے کہ مکان لے لیجیے۔ پھر جس طرح چاہے ان سے معاملت رکھیے گا۔

مرزا عابد حسین :۔ پنڈت صاحب اصل امر تو یہ ہے کہ ایسے شخص کی معرفت مکان لینا بھی کسی قدر مسلکِ احتیاط سے دور ہے۔ مگر آپ فرماتے ہیں کہ اور کوئی مکان نہیں مل سکتا اور اصل معاملہ ایک شخص ثالث سے ہے کہ جس کا نام آپ نے لیا تھا؟

پنڈت جی :۔ شیو رتن!

مرزا صاحب :۔ شیو رتن سے۔ لہٰذا مکان لیے لیتا ہوں لیکن ان کے اس عجیب اخلاق کی وجہ سے مجھے خواہ مخواہ ایک قسم کا تعلق خاطر ہو گیا۔ لکھنؤ جو کہ میرا وطن اصلی ہے، وہاں کے عامیانہ اطوار وادضاع سے مجھے نفرت ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ باہر جاکے ایسے لوگوں سے دور رہوں گا مگر یہاں بھی وہی سامنا ہوا۔

پنڈت جی :۔ جی ہاں۔ کیا کیا جائے۔ باہمیں مردماں بباید ساخت۔

اس کے بعد پنڈت جی رخصت ہونے کو تھے کہ فدوی میاں پھر نازل ہو گئے اور آتے ہی فرمانے لگے "پنڈت جی! پھر مکان دیکھ لیجیے"

مرزا صاحب نے ذرا تامل کیا۔ لیکن پنڈت جی بھی فدوی کے ہم زبان ہو گئے۔ لیکن مرزا صاحب بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

پنڈت جی کی ٹمٹم سرا میں موجود تھی۔ مرزا صاحب اور پنڈت جی داہنے بائیں اور عقب میں فدوی میاں اور ایک حوالدار جو پنڈت جی کے ساتھ تھا بیٹھ گئے۔ گاڑی روانہ ہوئی۔ راستہ میں فدوی میاں اور حوالدار میں بڑے تپاک سے باتیں ہوتی جاتی تھیں۔ جس قدر حوالدار پنڈت جی کی ہمراہی کی وجہ سے لحاظ کرتا تھا اسی قدر فدوی میاں بے باک تھے۔

اثنائے راہ میں بلا مبالغہ سَو دو سَو آدمیوں نے فدوی میاں کو سلام کیا ہوگا۔

فدوی میاں سلام! فدوی میاں سلام۔ یہ صدائیں دس دس بارہ بارہ قدم کے فاصلے سے سنائی دیتی تھیں۔

سلاموں کی ترتیب یہ تھی کہ جو ملا پہلے اس نے تھانہ دار صاحب کو سلام کیا۔ ماتھے پر ہاتھ رکھ کے اور بہت مؤدبانہ جھک کے۔ یہ اوّل درجے کا سلام تھا۔ دوسرے درجے کا سلام مرزا صاحب کو کیا۔ مگر وہ بھی بلا صَوت و صدا۔ تیسرا سلام ان لفظوں کے ساتھ حوالدار صاحب سلام۔ ماتھے پر ابھی تک ہاتھ رہتا تھا۔ چوتھا سلام آواز بلند کے ساتھ فدوی میاں سلام!

فدوی میاں کا جواب بھی خصوصیات کے ساتھ ہوتا تھا۔ بھتا سلام۔ مہتو سلام۔

اس درمیان میں کئی دیہاتی رنڈیوں نے بھی سلام کیا۔ فدوی میاں ہر ایک کا نام لے لے کے سلام کا جواب دیتے تھے۔ بیبا جان سلام۔

رسولن سلام۔

ہر سلام کے بعد فدوی میاں مزاج پرسی کو بھی واجب سمجھتے تھے۔ اور ہر شخص کے ساتھ طرز پرسش میں جدت ہوتی تھی۔

گاڑی اس مکان تک پہنچی جسے دیکھنا منظور تھا۔ واقعی مکان قابل رہنے کے تھا۔ زنانہ مکان پختہ۔ دو منزلیں۔ باہر بیٹھنے کا مکان جسے قصباتی زبان میں بیٹھکہ (بہ تشدید قاف) کہتے ہیں۔ نہایت ہی معقول اور اس کے سامنے بڑا سا احاطہ تھا۔ اس میں ایک طرف کھپریلیں تھیں۔ گاڑی، گھوڑے اور سائیس، خدمت گار وغیرہ کے رہنے کے لیے۔ جا بجا کچھ درخت مختلف قسم کے لگے ہوئے تھے مگر بہت ہی بے تکے پن سے۔ کچھ بیلا چنبیلی، کے جھنڈ۔ کچھ مہندی کی روشیں۔ بانس کا پھاٹک لگا تھا۔ غرض کہ مکان مرزا صاحب کو پسند آیا۔ شیورتن بھی اس موقع پر پہنچ گیا تھا۔ ایک سیاہ فام سا آدمی۔ دھوتی بندھی ہوئی۔ اودی چھینٹ کی مرزئی پہنے۔ اسی چھینٹ کی دوہری ٹوپی۔ پاؤں میں چمرودا جوتا۔ گلے میں ایک بٹوہ پڑا ہوا۔ یہ آپ کا درباری لباس تھا۔ کیوں کہ اس وقت آپ براہِ راست کچہری سے تشریف لائے تھے۔ تھانے دار صاحب اور مرزا صاحب کے آنے کی خبر سن کے دوڑے چلے آئے۔ شیورتن سے کرایہ کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ اس موقع پر فدوی میاں ذرا اٹل گئے۔ سات روپیہ ماہوار پر وہ مکان لے لیا گیا اور اسی شب کو مرزا صاحب کا اسبابِ سفر وہاں آگیا۔

دو پلنگ، تین کرسیاں فدوی میاں کی سرکار سے بلا طلب بھیج دی گئیں اور طوعاً و کرہاً مرزا صاحب کو رکھنا پڑیں۔

دریاں اور قالین مرزا صاحب کے ہمراہ تھے۔ کھانا پکانے کے

برتن بھی کافی موجود تھے۔ مکان کی صفائی اور مختصر سامان کی آراستگی میں فدوی میاں کی دخل درمعقولات ہوتی رہی۔ ایسے لوگ جو ہر کسی کام میں خواہ مخواہ دخیل ہو جاتے ہیں، ان میں ایک خاص وصف ہوتا ہے جسے کسر نفس کے سوا اور کیا کہا جائے یعنی اس قسم کے لوگوں کو دوسروں کی اختلاف رائے سے چنداں ملال بھی نہیں۔ اگرچہ وہ اختلاف بُرے تیوروں سے کیا جائے۔ مثلاً اگر ان کی رائے ہوئی کہ دری اس طرح بچھانا چاہیے۔ اور پلنگ یوں لگانا چاہیے اور میز کا رخ یوں رہے اور دیوارگیریوں کا وہ موقع ہے اور دوسرے شخص کی آسائش کا یہ اہتمام کر رہے ہیں۔ ان میں سے ہر تجویز کو بلا دلیل یا یہ الفاظ کہہ کے "صاحب آپ نہیں جانتے" مسترد کر دیا۔ ہر ایک میں ترمیم کر دی تو ان کو نہ کچھ خفّت ہوگی نہ ملال۔ ایسے ہی ہمارے سادہ دل رئیس موضع سہجن پور فدوی میاں صاحب تھے۔

جب گھر کی صفائی اور آرستگی سے فراغت ہوئی اور ہر چیز اپنے اپنے موقع سے لگا دی گئی۔ فدوی میاں نے فرمایا۔

لیجئے اوّرسیر صاحب آپ کا مکان سج سجا گیا اور اب جس چیز کی ضرورت ہو وہ حاضر کر دی جائے کیوں کہ خدا کے فضل سے سب کچھ ممکن ہے۔ فقط آپ کے اشارے کی دیر ہے۔

مرزا صاحب:۔ آپ کی عنایت کافی ہے۔ یہ سامان بھی میری ضرورتوں سے زیادہ ہے اور جو کچھ ضرورت ہوگی عرض کر دیا جائے گا۔

یہ آخری جملہ مرزا صاحب نے اس خیال سے کہا تھا کہ تھانہ دار صاحب نے پہلے ہی کہا تھا کہ گھوڑا فدوی میاں کی کوشش سے بہت جلد اور کفایت سے مل جائے گا۔ مگر فدوی میاں کو سلسلۂ کلام کے طول دینے کا

شوق تھا۔

فدوی میاں :۔ اسے تو فرما دیجیے نا۔ تاکہ اس کی ابھی سے فکر کی جائے۔

مرزا صاحب کے پاس اتفاق سے روپیہ نہ تھا۔ ان کو یہ خیال ہوا کہ ابھی کہنا کیا ضرور ہے۔ پہلے روپے کی فکر ہو جائے تو دیکھا جائے گا۔

مرزا صاحب :۔ عرض کر دوں گا۔

فدوی میاں :۔ تو آپ فرماتے کیوں نہیں اور چار پائیوں کی ضرورت ہو تو بھجوا دی جائیں۔ چینی کے برتن، پتیلیاں، لوٹے، گھڑے، مٹکے۔ غرض کہ جس طرح لڑکے پہیلی بجھواتے ہیں، یہ ایک ایک چیز کا نام لیے جاتے تھے اور مرزا صاحب نہیں نہیں کہے جاتے تھے۔ ان کی سخاوت اور سفاہت پر اگر کوئی اور ہوتا تو کھل کھلا کے ہنس دیتا۔ مگر مرزا بہت ہی مہذب اور متین آدمی تھے۔ اس پر بھی متبسم ہو گئے۔ مرزا کے تبسم سے فدوی میاں بغوائے ع فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست۔ کچھ اور ہی سمجھے کہ مزاج کے سادے تھے۔ بے تکلف فرمانے لگے۔

فدوی میاں :۔ اچھا تو اس میں تکلف کیا ہے۔ کوئی پُتریا بلا دی جائے۔ کیوں کہ اس میں ہرج کیا ہے۔ آپ نوجوان آدمی ہیں اور پھر لکھنؤ کے رہنے والے۔

مرزا کے کان اس قسم کی گفتگو سے آشنا نہ تھے۔ یہ ایک خشک آدمی تھے۔

مرزا صاحب :۔ جناب آپ نے میرے اخلاق کا غلط اندازہ کیا۔ میں اس قسم کے مذاق کا آدمی نہیں۔ آپ کی خواہ مخواہ عنایتوں کا میں مجبوراً ممنون ہوں۔ آئندہ مجھ کو ایسے مذاق سے معاف رکھیے گا۔

فددی میاں :۔ (بظاہر جھینپ کے اور عجلت زدہ صورت بنا کے دو تین طمانچے زور زور سے اپنے گالوں پر لگا کے اور دونوں کان مروڑ کے) توبہ! توبہ! خطا ہوئی۔ معاف کیجیے گا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ آپ مولوی آدمی ہیں۔

مرزا صاحب :۔ نہیں۔ آپ کا کچھ قصور نہیں۔ یہ اس زمانے کی تہذیب کا قصور ہے۔ شاید آپ کو اسی طرح کے لوگوں سے زیادہ ملنے کا اتفاق ہوا ہوگا جو بیہودہ دل لگی، مذاق یا چوسر، گنجفہ وغیرہ میں اپنے اوقات کو ضائع کیا کرتے ہیں۔ اگر میں مولوی نہیں مگر طالب علم ضرور ہوں۔

مرزا اپنی نیک نفسی سے فددی میاں کی اس بات کو دل لگی سمجھے تھے۔ حالانکہ فددی میاں کا ما فی الضمیر حقیقت کا مشعر تھا نہ مجاز کا۔ کیوں کہ آپ کی ذات والا صفات سے یہ فیض اکثر ملازم پیشہ لوگوں کو پہنچتا رہتا تھا۔ تاہم اپنی نیک نیتی سے کہہ سکتے ہیں کہ اس میں کوئی منفعت ذاتی از قسم زر فددی میاں کو نہ تھی بلکہ ان کا مذاقِ طبیعت اسی قسم کا واقع ہوا تھا۔ ضلع کی کونسی پتریا ایسی تھی جو آپ کی ممنونِ منت اور مطیعِ فرمان نہ ہو۔ ایک تو اس لیے کہ زمانۂ ثروت میں آپ نے بالتخصیص اس فرقے کے ساتھ بہت سلوک کیا تھا۔ اکثر باغات اور آراضی آپ کی عطیہ رنڈیوں کے قبضے میں موجود تھیں۔ چار ہی دن کا ذکر ہے۔ چھوٹے صاحبزادے چھنن میاں کی تقریب ختنہ میں دس بیگہ زمین بی دفاتن کو، بیس درخت آم کے مع آراضی بی رسولن کو دیے تھے۔ اسی تقریب میں موضع سیجن پور رہن ہوا تھا۔ یہ سب اوصاف فددی میاں کے مرزا صاحب کو معلوم ہوتے رہے اور اسی قدر تنفران کے اخلاق سے بڑھتا گیا۔

اگرچہ گھوڑے کی خرید میں فدوی میاں کی رائے شریک رہی اور اسی طرح اور معاملات میں خواہی نخواہی ان کا دخل رہا۔ لیکن مرزا ہر امر میں حتی الامکان ان سے دور بھاگتے تھے۔ لیکن فدوی میاں کی وضعداری سے بعید تھا کہ مرزا صاحب کے پاس جانا ترک کرتے۔ بلکہ ان کو ایک طرح کی محبت مرزا سے ہوگئی تھی۔ اور کچھ ایسا اخلاقی دباؤ پڑ گیا تھا کہ ان سے کسی قدر ڈرتے تھے۔

فدوی میاں کو کئی مرتبہ مرزا کے سامنے اپنے منہ پر طمانچے مارنے اور کان مروڑنے کا اتفاق ہوا۔ اس لیے کہ یہ موقع پر بول اٹھتے تھے مثلاً فدوی میاں کو یہ مسئلہ مرزا کی ذات سے تحقیق ہوا کہ وہ چیز جو عموماً بالائی آمدنی کہلاتی ہے، اس کا لینا بالکل حرام ہے۔

فدوی میاں صوم وصلوٰۃ کی پابندی اور ناجائز کھانے پینے کی چیزوں سے اجتناب کرنے کو مولویت اور زہد و ورع خیال کرتے تھے۔ ناجائز طریقوں کے اکتسابِ منفعت کرنے کو یہ گناہ ہی نہ جانتے تھے بلکہ حرام سمجھتے تھے۔

مرزا عابد حسین سے ان کو یہ بھی معلوم ہوا کہ شادی بیاہ میں ناچ رنگ یا عید بقر عید مُجرا دیکھنا یا بغیر مجرا دیکھے ہُتڑوں کو انعام دینا گناہ ہے۔ فدوی میاں کو مرزا عابد حسین کی صحبت سے اکثر ایسے امور معلوم ہوئے جن کو یہ نیکی سمجھتے تھے مگر درحقیقت وہ بدی تھے۔ رفتہ رفتہ فدوی میاں کو مرزا صاحب سے وہ اعتقاد ہوگیا جو مقلد کو اپنے مجتہد سے یا مرید کو اپنے پیر سے ہونا چاہیے۔ مگر فدوی میاں کی عادتیں اس حد تک خراب ہو چکی تھیں کہ ان کی اصلاح محال تھی۔ اہلِ عملہ کی خوشامدِ بے جا، سعی وسفارش، جھوٹ بولنا، جھوٹی قسمیں کھانا، فحش اور بے تکے مذاق، راتوں کو رنڈیوں کا دربار، جھوٹے مقدموں

کی اطاعت، بدمعاشوں کی حمایت اور اسی قسم کے لاکھوں معائب ان میں موجود تھے مگر ان سب معائب کے ساتھ ایک وصف بھی تھا وہ یہ کہ خاندانی شرافتِ نفس کی وجہ سے طمع ان میں نہ تھی۔ اگرچہ اس وصف کے ساتھ ایک عیب بھی تھا یعنی اسراف جس کو لوگ جہالت سے اولوالعزمی کہتے ہیں۔ مرزا صاحب ان کے اس وصف کو پہچان گئے تھے۔ مرزا کا خیال تھا کہ ان کی یہ عادتیں کسی حد تک ترک ہو سکتی ہیں بشرطیکہ کسی خاص اخلاقی قوت سے ان کے نفس پر اثر ڈالا جائے۔ مرزا نے تجویز کیا کہ مذہبی جوش اگر آپ کی طبیعت میں پیدا کر دیا جائے تو ممکن ہے کہ ان کی اولوالعزمی ان کو اس طرف متوجہ کر دے۔

فدوی میاں کے دو لڑکے تھے ایک نثار علی جس کا سن چودہ برس کا۔ دوسرا احمد حسن جس کا سن سات آٹھ برس کا تھا۔

نثار علی آوارگی کی حد تک پہنچ گیا مگر ایک خاص صفت جو قصبات اور دیہات کے لڑکوں میں پائی جاتی ہے یعنی شرم۔ اگرچہ وہ حدِ اعتدال سے کسی قدر زیادہ ہوتی ہے لیکن وہی اُن کی درستی کا باعث ہو گئی۔

فدوی میاں اپنے لڑکوں کی تعلیم سے غافل نہ تھے۔ ایک مولوی صاحب برسوں سے دروازے پر نوکر تھے مگر لڑکا گلستاں کا باب اوّل پڑھتا تھا۔ کئی سال ہو چکے تھے مگر اس کے ختم ہونے کی نوبت نہ آتی تھی۔ اور چھوٹا بغدادی قاعدہ سامنے لیے بیٹھا رہتا تھا۔ مرزا صاحب نے رفتہ رفتہ فدوی میاں کے معاملاتِ خانگی میں دخل دینا شروع کیا اور جس قدر مرزا صاحب ان کے معاملات میں دخیل ہوتے جاتے تھے، فدوی میاں اپنی ذمہ داریاں مرزا کے سپرد کرتے جاتے تھے۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ

فدوی میاں کا ہر کام مرزا نے اپنے ذمہ لے لیا۔ فدوی میاں کی وہ اس طرح محافظت اور نگرانی کرتے تھے جو نابالغ یا مجنون کے دلی کو کرنا چاہیے اور فدوی میاں روز اول سے کچھ ایسا دباؤ مرزا صاحب کا مان گئے تھے کہ بغیر ان کے صوابدید کے کوئی کام نہ ہوتا تھا۔ جس قدر مرزا صاحب فدوی میاں پر توجہ کرتے جاتے تھے۔ شیورتن کو مرزا صاحب سے خوف پیدا ہوتا جاتا تھا۔ مرزا صاحب کو فدوی میاں اور شیورتن کے معاملات میں بھی کچھ گنجلک اور غبن معلوم ہوئی اور درحقیقت ایسا ہی تھا۔ مرزا صاحب خود فرماتے ہیں کہ یہ راز مجھ پر شیورتن کی چشم دابرد سے ظاہر ہوگیا۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ مجھے شیورتن کی نگاہیں فدوی میاں کے سامنے جھینپتی سی معلوم ہوتی تھیں۔ اس سے مجھے معلوم ہوگیا کہ اس نے کسی قسم کی چالاکی ان کے معاملات میں ضرور کی ہے اور وہ فدوی میاں سے کسی قدر دبتا بھی تھا۔ اس سے اور بھی یقین ہوگیا تھا کہ ابھی تک اس کی چالاکی کا تدارک فدوی میاں کے اختیار میں ہے۔

فدوی میاں کا اہلِ عملہ کے پاس دوڑ دوڑ کے جانا۔ اس سے بھی مجھے ایک قسم کا شبہ سا پیدا ہوتا تھا کہ شاید فدوی میاں ان معاملات کے تدارک کی فکر میں ہیں۔ مگر ان کی بے پروائی نے اس شبہہ کو دفع کر دیا تھا۔

مرزا صاحب فدوی میاں کو خفیف العقل سمجھتے تھے۔ اس لیے اپنے خیالات کو ان سے ظاہر کرنے میں تامل تھا۔ اس لیے کہ وہ شاید اس راز کو ظاہر کر دیں کہ مرزا کو ان کے معاملات کی درستی کی غیر معمولی فکر ہے۔ ان امور پر نظر کر کے مرزا نے خفیہ تحقیقات کرنا شروع کی شیورتن

ایک بڈھا آدمی تھا۔ وہ فدوی میاں کے والد کے زمانے میں ان کے کسی موضع کا ضلع دار تھا۔ جس زمانے میں فدوی میاں کے والد شیخ قربان محمد صاحب نے انتقال کیا، فدوی میاں جن کا اصلی نام شیخ فدا علی تھا، بہت ہی کم سن تھے۔ تولیت جائداد کی ان کے ماموں شیخ احمد کے سپرد ہوئی تھی۔ شیخ احمد ایک مشہور جعلیہ تھا۔ شیخ احمد کی تولیت کے زمانے میں بھی شیورتن کارکن رہا۔ بعد تحقیقات کے معلوم ہوا کہ شیخ احمد اور شیورتن کی سازش سے اس معاملے میں کوئی جعل ہوا ہے۔ مگر یہ پتہ نہ لگتا تھا کہ کیونکر اور کیا جعل ہوا ہے۔ مرزا کا خود بیان ہے کہ اس مقدمہ کی تحقیقات کا مجھے ایسا شوق ہو گیا تھا کہ راتوں کو نیند نہ آتی تھی۔ ذرا ذرا سی باتوں کو علمی مشاہدات کے طور پر جانچتا اور پرتالتا تھا۔ شیورتن کے تمام حرکات وسکنات پر شب و روز میری نظر رہتی تھی۔ اگرچہ اس سے مہینے میں شاید ہی دو ایک مرتبہ میری اس کی ملاقات ہوتی تھی وہ بھی چند منٹ کے لیے مگر میرا خیال ہر وقت اس کے ساتھ رہتا تھا۔ فدوی میاں اگرچہ بہت ہی سفیہ اور خفیف الحرکات آدمی تھے مگر اپنی آبائی جائداد کو اپنے والد کے ایک ادنیٰ ملازم کے قبضے میں دیکھ کر ایک قسم کی حسرت جو ان کے بشرے پر ظاہر ہوتی تھی اس پر مجھے کمال تاسف ہوتا تھا اور جب سے میں یہ سمجھ گیا تھا کہ اس مقدمے میں شیورتن نے یقیناً جعل کیا ہے۔ اس وقت سے میرا بس نہ تھا کہ اس کو علاقے سے بے دخل کر کے فدوی میاں کو اس کی جگہ قابض کرا دوں مگر میرا کوئی اختیار نہ تھا۔ ظاہرا یہ امر محال معلوم ہوتا تھا اور سب سے زیادہ اہم ان خیالات کی رازداری تھی۔ اس لیے کہ افشائے راز میں ناکامیابی کا اندیشہ ایک طرف۔ شماتت کا خیال دوسری طرف دامن گیر تھا۔ آخر بڑی مشکل سے بعض واقعات کا پتہ لگا۔ پھر تو پیچ در پیچ مشکلیں آسان ہونے لگیں اور

برسوں کی الجھی ہوئی گتھیاں سلجھ گئیں۔

معلوم ہوا کہ شیخ قربان علی فدوی میاں کے والد نے لکھنؤ میں وفات پائی تھی۔ سببِ وفات مرضِ وبائی مشہور تھا۔ شیخ فدا علی کی والدہ اپنے شوہر کے سامنے مر چکی تھیں۔ شیخ احمد ان کا سوتیلا بھائی تھا۔

شیخ قربان علی کے لکھنؤ جانے کا سبب ایک مقدمۂ اپیل تھا۔ مقدمہ کی روداد یہ تھی کہ کسی راجپوت مسمّی ماندھاتا نے بندوبست کے زمانے میں شیخ قربان علی کے علاقے پر دعویٰ کیا تھا۔ سرسری مقدمہ حاکم بندوبست نے خارج کر دیا۔ اس نے نمبری نالش کی۔ وہ بھی خارج ہوئی۔ پھر اس نے اپیل کی۔ اپیل بھی خارج ہوئی۔ پھر اس نے اپیل ثانی کی۔ یہاں وہ تمام لوگوں کے خلافِ امید جیت گیا۔ جس دن عدالت العالیہ سے مقدمہ اس کے حق میں فیصل ہوا۔ وہی دن شیخ قربان علی کی وفات کا تھا بلکہ اکثر لوگوں کو یہ گمان ہوا کہ شیخ خودکشی کر کے مر گئے۔ اپیل سے جیتنے کے بعد چاہیے تھا کہ قابضِ جائداد ماندھاتا یا اس کے وارث ہوتے مگر بخلاف اس کے قابضِ جائیداد شیخ احمد اور شیو رتن ہوئے۔ شیخ احمد لاوارث مر گئے۔ اس کے بعد شیو رتن بلا مزاحمت احدے اور بے مشارکت غیرے تمام علاقے پر قابض اور متصرف رہا۔ فدوی میاں کے ساتھ اس کا سلوک اس طرح کا ہے جیسے کسی نمک حلال قدیم نوکر کو جو کسی وقت میں ملازم تھا، اپنے آقازادہ کے ساتھ ہونا چاہیے۔ جواب مفلس ہو مگر اس سلوک میں ظاہرداری کسی نہ کسی طرح کھل جاتی تھی۔ جائداد پدری سے ایک بسوہ زمین شیخ فدا علی کو نہیں ملی۔ موضع سہجن پور جس کا نمبر اب تک ان کے پاس ہے اور جو شیو رتن کے پاس کئی سال پیشتر رہن ہو چکا تھا، وہ موضع ان کی والدہ کا تھا، کل جائداد کا مالک بالفعل شیو رتن تھا جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔

حتٰی کہ مکانات بھی اسی کے نام رہن ہیں۔ مگر وہ بطور ماہ بماہ محتاج شیخ فدا علی کو گذارہ دیتا ہے اور موضع بھجن پور کے آسامیوں سے جو کچھ چھین جھپٹ کے وصول ہو جاتا تھا وہ گویا بالائی آمدنی ہمارے عنایت فرما شیخ فدا علی صاحب کی ہے۔ مرزا کو یہ واقعات جو اوپر بیان کیے کئی برس کی تحقیق کے بعد معلوم ہوئے۔ یہ تو ان پر ظاہر ہو گیا تھا کہ اس معاملہ میں کسی قسم کی چالاکی ہوئی ہے۔ رہا یہ امر کہ وہ قابلِ تدارک ہے یا نہیں۔ اس کا فیصلہ تفصیلی حالات کے معلوم ہونے کے بعد ہو سکتا ہے۔ منہ سے کوئی بات نکالنا ایک تو اس مقدمہ کے لیے مُضر تھا جس کا سبب اوپر بیان ہو چکا ہے اور مرزا کا استقلال بھی اس کا مقتضی تھا کہ جب تک کوئی صورت یقینی کامیابی کی نہ پیدا ہو ایسی باتوں کا منہ سے نکالنا سفاہت پر محمول کیا جائے گا۔ ان کا یہ منصوبہ تھا کہ کیا خوب ہو اگر میں اس معاملے کا پورا پتہ لگا کے اور تدارک کی کافی تدبیر کر کے اُس کو زبان سے نکالوں۔ پانچ برس تک اس معاملے سے مرزا کو تعلق خاطر رہا۔ فدوی میاں تو روز ہی مرزا کے پاس موجود رہتے تھے اور شیو رتن بھی کبھی کبھی آنکلتا تھا مگر دونوں کو ان کے کسی اشارے کنائے سے یہ نہ ثابت ہوا کہ وہ ان کے حق میں کیا کرنے والے ہیں؟ اس اثناء میں کئی بار ان کو لکھنؤ آنے کا اتفاق ہوا۔ جوڈیشل کے محافظ خانے میں دن بھر گذر گیا۔ کل مقدمے کی روداد سے انھوں نے واقفیت حاصل کر لی۔

جب تحقیقات کما حقہٗ کر چکے تو اس راز کو ایک خاص مطلب کے لیے راقم الحروف (مرزا رسوا) پر ظاہر کیا اور بعض امور مجھ کو تعلیم کیے جس کا حال ناظرین کو آئندہ بیان سے معلوم ہو جائے گا۔ اس مطلب کے لیے مجھ کو مرزا کے پاس ضلع جانا پڑا۔ اتوار کا دن تھا۔ مرزا دیوان خانہ (بیٹھکے) میں

تشریف رکھتے ہیں۔ فدوی میاں اور مجھ سے مذاق کی باتیں ہورہی ہیں کہ مرزا نے اپنے اردلی کے چپراسی کو بلا کے کہا۔ شیورتن کو بلا لاؤ۔ شاید اس سے پہلے مرزا نے کسی موقع پر شیورتن کو یاد نہ کیا ہوگا۔ میں اس معاملے سے واقف تھا۔ مگر فدوی میاں کو البتہ تعجب ہوا ہوگا کہ آج شیورتن خلافِ معمول کیوں بلایا جاتا ہے۔

شیورتن حسب الطلب سامنے آکھڑا ہوا۔ مرزا نے بیٹھنے کا اشارہ کیا، وہ بیٹھ گیا۔ مرزا نے اس سے چند معمولی غیر ضروری باتیں کرکے مجھ سے مخاطب ہوکے پوچھا۔

مرزا :- ہاں تو ولایت علی خاں مرگیا ؟

میں نہیں بیان کرسکتا کہ اس کا نام سننے کے بعد شیورتن کے دل پر کیا گذری اور اس کے چشم وابرو سے کس قسم کے آثار پائے گئے۔

میں :- جی ہاں مرگیا۔ اس کو مرے ہوئے دو مہینے ہوئے ہوں گے۔

مرزا :- آپ جانتے ہیں یہ کون شخص تھا ؟

رسوا :- میں خوب جانتا ہوں کہ کٹاری ٹولے کے متصل وہ گلی جو کالکوں کی طرف جاتی ہے، نیم کے درخت کے سامنے۔

مرزا :- آپ خوب جانتے ہوں گے مگر آپ نے سنا ہوگا کہ کس بری گت سے مرا ہے۔

رسوا :- جی ہاں! بندگانِ خدا کی حق تلفی کا یہی انجام ہوتا ہے۔

مرزا :- سنتے ہیں لاوارث تھا۔ مرنے کے بعد کل اسباب پولیس میں اٹھ گیا ہوگا اور یقین ہے کہ پولیس ہی نے اسے دفن کیا ہو۔

رسوا :- جی ہاں! یہی ہوا اور ہونا ہی کیا تھا۔

مرزا :۔ اور جو تکیہ اس کے سرہانے رہتا تھا ؟
رسوا :۔ اس کا حال پھر عرض کروں گا۔

اس گفتگو کے بعد ہم اور مرزا ادھر ادھر کا ذکر کرنے لگے۔ شیو رتن کے چہرے پر مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ وہ ابھی اٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ مرزا نے گاڑی کسوانے کا حکم دیا۔ مرزا صاحب اور میں دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ مرزا صاحب نے فدوی میاں کا ہاتھ پکڑ لیا۔ گاڑی پر سوار ہوئے۔ راستے میں سوائے اس جملہ کے جو مجھ سے مخاطب ہو کے کہا تھا۔

" کیوں دیکھا آپ نے۔ ہم نہ کہتے تھے " جس کا جواب میں نے یہ عرض کیا تھا " جی ہاں ! آپ کا خیال بہت صحیح تھا " اور کوئی گفتگو اس مقدمہ کی نہیں ہوئی۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ شیو رتن رات ہی کو لکھنؤ گیا۔

اس واقعے سے ہمارے خیالات اور پختہ ہو گئے۔ کئی دن کے بعد لکھنؤ سے واپس آیا۔

مرزا کا موکّل شنکرم، میں شیو رتن کے ساتھ ساتھ تھا۔ شنکرم لکھنؤ پہنچا۔ موکل ساتھ تھا شیو رتن امین آباد کی سرا میں اترا۔ وہاں تھوڑی دیر ٹھہر کے چوک کی طرف روانہ ہوا۔ گول دروازے کے قریب بان والی گلی کی طرف سے ولایت علی خاں کے مکان پر پہنچا۔ (جس دکان میں ولایت علی خاں رہتا تھا وہاں اب شیوالہ بن گیا ہے) شیو رتن وہاں کے دکان داروں سے کچھ پتہ دریافت کر کے اس چھتّہ کی طرف چلا جہاں تیرہ و تاریک گلیاں بہت دور تک چلی گئی ہیں۔ اس کے بعد ایک نالہ ملتا ہے پھر ایک ٹیکرا سا ملا، اس پر گیا۔ وہاں ایک شخص کو آواز دی وہ گھر سے نکلا۔ دونوں میں کچھ باتیں ہوئیں۔ ولایت علی خاں کو مرے ہوئے دوسرا مہینہ تھا۔ یہ ٹھیک پولیس کی

معرفت دفن ہوا تھا مگر تکیہ کا پتہ نہ ملا۔ اس کے بعد موکل اور شیورتن دونوں امین آباد کی سرا میں آئے۔ اس نے حلوائی کی دکان سے پوریاں لے کے کھائیں۔ موکل نے بھی اسی حلوائی سے پوریاں لیں۔ اس کے بعد شیورتن نظیر آباد کی طرف چلا۔ اس کے بعد اس نے دو دن تک کچہریوں کی خاک چھانی۔ آخر مایوس ہو کر ضلع کو واپس چلا۔ موکل اُس سے ایک دن پہلے ہمارے پاس پہنچ گیا تھا۔

وہ تکیہ جس میں شیورتن کی جان تھی۔ ہمارے قبضے میں کئی مہینے پیشتر آچکا تھا۔ اس میں چند کاغذات تھے اور وہ کاغذات سب فدوی میاں کے علاقے کے متعلق تھے۔

اب ہم اس جعل سازی کو کھولے دیتے ہیں۔ اصل واقعہ یہ ہوا کہ ماندھاتا عدالت العالیہ سے مقدمہ ہار گیا تھا جیسی کہ توقع تھی مگر اسی کے دوسرے یا تیسرے دن شیخ قربان علی نے بعارضۂ فصلی بخار انتقال کیا جیسا کہ ظاہراً ثابت ہوتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ شیورتن اور شیخ احمد جو شیخ مرحوم کے ہمراہ تھے۔ ان دونوں نے سازش کر کے شیخ کو کچھ کھلا پلا دیا ہو۔ مگر اس قدر عرصے کی بات تھی، اس کا ثبوت دشوار بلکہ محال ہے۔ علاقے کے باب میں یہ چالاکی کی گئی کہ اصل فیصلہ محافظ خانے سے اڑا کے اور بجائے اس کے ایک فیصلہ بحق ماندھاتا ولایت علی خاں کی معرفت بنوا لیا گیا۔ پھر ماندھاتا اور شیخ احمد اور شیورتن میں کچھ ایسا من سمجھوتہ ہو گیا کہ ماندھاتا کچھ رقم معتدبہ لے کے علیحدہ ہو گیا اور اس سے ایک رہن نامہ بنام شیورتن ہو گیا۔ شیخ احمد کے نام رہن نامہ ہوتا مگر اس کی حیثیت اس لائق نہ تھی۔ اور شیورتن، شیخ قربان احمد کے زمانے ہی میں لین دین کرتا تھا اور بڑا روپیہ والا مشہور

تھا۔ اصل فیصلہ عدالت جو ولایت علی خاں کو بطور نمونے کے دیا گیا تھا وہ اس نے دبا رکھا اور اس کے ذریعے وہ شیورتن کو وقتاً فوقتاً دبا کر کچھ لے لیا کرتا تھا۔

آخر میں ولایت علی خاں نابینا ہو گیا تھا۔ جب وہ خرچ سے تنگ ہوتا تو ایک خط دباؤ ڈالنے کے لیے شیورتن کو لکھ بھیجتا۔ وہ کچھ نہ کچھ بھیج دیا کرتا تھا مگر قلیل مقدار۔ اس لیے کہ شیورتن خوب جانتا تھا کہ ولایت علی وہ کاغذات پولیس یا عدالت میں داخل نہیں کر سکتا اس لیے کہ وہ خود بھی مجرم ہے مگر پھر بھی احتیاطاً کچھ دے نکلتا تھا۔ جب مرزا اس مقدمے کی تحقیقات میں مصروف ہوئے۔ ایک دن شیورتن کے نام ایک پوسٹ کارڈ مرزا کی ڈاک کے ساتھ چلا آیا اس پوسٹ کارڈ میں اگرچہ کوئی امر تفصیلی طور سے نہ لکھا تھا مگر ولایت علی خاں کو مرزا اچھی طرح جانتے تھے۔ ولایت علی خاں کا نام پوسٹ کارڈ پر دیکھتے ہی گویا تمام مقدمہ کا پتہ چل گیا۔ پوسٹ کارڈ کا مضمون یہ تھا۔

"شیورتن کو معلوم ہو کہ ہمارا آخری وقت ہے۔ کچھ ہماری مدد کرنا چاہیے۔ کاغذات ہم سے لے لو اور جو کچھ تم سے ہو سکے ہم کو دے دینا۔ ورنہ ہتا کیا کرتا۔"

اس پوسٹ کارڈ کو مرزا نے دبا رکھا اور ایک موکل شیورتن کی طرف سے ولایت علی خاں کے پاس گیا اور پچاس روپے دے کے وہ کاغذات اس سے حاصل کر لیے۔ اس کے چند ہی روز بعد ولایت علی داصل جہنم ہوا۔ واقعی بہت بری طرح سے مرا۔ جیسے بے ایمانوں کا یہی انجام ہونا چاہیے۔

ان واقعات کے مفصل ذکر کے بعد اب اس کے کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ شیورتن کس قدر سہولت کے ساتھ تمام جائداد سے دست بردار ہونے پر راضی ہو گیا ہوگا۔ باہمی فیصلہ کر لینا مناسب وقت تھا۔ اس

لیے کہ اگرچہ جعل کا ثبوت قطعی ہاتھ آگیا تھا اور شیورتن واقعی مجرم تھا۔ اس لیے وہ بہت خائف تھا۔ مگر بہت عرصے کی بات تھی اس لیے مرزا کی احتیاط اسی کی مقتضی ہوئی کہ یہ مقدمہ عدالت تک نہ جائے اور شیورتن بھی یہی چاہتا تھا۔ لہٰذا شیورتن نے کل جائداد کا بیع نامہ فدوی میاں کے نام کر کے صرف ایک موضع اپنے نام چھڑوالیا اور اس فیصلے کے چند ہی روز کے بعد تیرتھ کو چلا گیا جہاں سے اس وقت تک واپس نہیں آیا۔

اب فدوی میاں کا حال نہ پوچھیے، پورے رئیس بن گئے۔ مگر مرزا کو ابھی تک اسی طرح مانے جاتے ہیں اور کوئی کام بغیر ان کی صلاح و مشورے کے نہیں کرتے۔

مرزا عابد حسین کا طریقۂ زندگی بالکل انوکھا ہے۔ ہم نے کسی شخص کو جو اوسط درجہ کا تموّل رکھتا ہو، اتنی محنت کرتے نہیں دیکھا۔ محنت کرنے پر اس قدر حریص کوئی ہندستانی ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ مرزا صاحب روز صبح کو چار بجے گرمی، برسات اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس وقت سے باغ میں نکل جاتے ہیں۔ وہیں نماز پڑھتے ہیں طلوع آفتاب کے ساتھ ہی پودوں کی دیکھ بھال شروع ہو جاتی ہے۔ قبل اس کے کہ ملازمین اور مزدور آئیں، ہر ایک کام تجویز ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ آتے کے ساتھ کام شروع کر دیتے ہیں۔ اکثر کاموں میں مرزا صاحب خود مدد دیتے جاتے ہیں۔ کھرپی یا پھاوڑے کو خود اٹھا کر کام میں مصروف ہو جانا اور اس بے تکلفی کے ساتھ کہ گویا اس کام کے لیے فطرت نے ان کو خلق کیا

تھا۔ کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام بھی نہیں جس سے مرزا بے پروائی کرتے ہوں یا محض نوکروں پر چھوڑ دیتے ہوں یا نوکروں کو ہدایت کرتے ہوں۔ مرزا کے نوکران کے احکام کی تعمیل میں ایسی مستعدی اور توجہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس کا نظیر ہم کسی ہندوستانی ملازموں میں نہیں پاتے۔ جب سب لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے ہیں تو مرزا لیبوریٹری (تجربہ گاہ) میں تشریف لے جاتے ہیں۔ یہاں علمِ طبیعات اور ٹکری کے تجربات ہوتے ہیں اور معمولاً دو گھنٹے یہاں رہتے ہیں۔ یہاں صرف ایک آدمی ان کا مددگار ہے۔ دس بجے کھانا کھاتے ہیں۔ کھانا کھانے کے بعد اخبار دیکھتے ہیں۔ گویا یہ گھنٹہ ان کی استراحت کا ہے مگر اس وقت بھی ان کو کسی نے پلنگ پر لیٹے ہوئے نہ دیکھا ہوگا۔ بہت بڑی استراحت یہ ہے کہ کبھی کبھی آرام چوکی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ استراحت کا زمانہ صرف آدھ گھنٹہ ہے۔ گیارہ بجے پھر کھیتوں پر جاتے ہیں۔ بارہ بجے تک وہیں رہتے ہیں۔ بارہ بجے ملازمین اور مزدوروں کو دو گھنٹے کی فرصت دے کے خود حدادخانہ یا نجارخانہ چلے جاتے ہیں۔ یہاں دو گھنٹے تک سخت محنت ہوتی ہے۔ اس دو گھنٹے میں مرزا کا ہاتھ کبھی ہتھوڑے یا بسولے یا کسی اور آلۂ حدادی یا نجاری سے خالی نہ دیکھا ہوگا۔ آدھا گھنٹہ باغ کی ضروریات کے متعلق صرف ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی چیز ٹوٹ پھوٹ گئی ہو تو اس کی مرمت کی جاتی ہے یا کوئی نیا آلہ صرف زراعت یا باغ کی ترقی کی غرض سے بنایا جاتا ہے۔ ڈیڑھ گھنٹہ تک علم جر ثقیل اور مختلف قسم کی کلوں کے نمونے تیار کرنے میں صرف ہوتے ہیں۔ دو بجے پھر کام پر جاتے ہیں۔ اس وقت زیادہ دیر تک نہیں ٹھہرتے صرف ۔۔ آدھ گھنٹہ میں کل کام کا معائنہ کرکے چلے آتے ہیں۔ تین

بجے سے چار بجے تک ایک گھنٹہ علم نباتات کے متعلق صرف ہوتا ہے۔ چار بجے گھر میں تشریف لے جاتے ہیں۔ یہ وقت اولاد کی تعلیم کی طرف توجہ کرنے کا ہے۔ اگرچہ ہر بچہ کی تعلیم کا جداگانہ اہتمام ہے۔ لڑکیوں پر آتو نوکر ہے۔ لڑکے جو مدرسے میں جانے کے قابل نہیں، وہ گھر پر مولوی صاحب سے پڑھتے ہیں۔ مگر مرزا ہر روز بلا ناغہ ہر ایک لڑکی یا لڑکے کا سبق سن کے خود چھٹی دیتے ہیں۔ پانچ بجے سے چھ بجے تک کا وقت تفریح کے لیے معین ہے۔ ان اوقات میں مرزا اکثر سوار بھی ہوتے ہیں۔ کبھی گھوڑے پر، کبھی بائیسکل پر، اور اگر کوئی دوست حسب دلخواہ آگیا تو اس کے ساتھ باغ کی اور زراعت کی سیر کرانے میں معروف رہتے ہیں۔

اس وقت ایک دن راقم الحروف ان کی زیارت سے مشرف ہوا تھا۔ واقعی جہاں مرزا رہتے ہیں وہ عجیب دلکش مقام ہے۔

پختہ سڑک سے ایک کچا راستہ اس فارم کو جاتا ہے۔ کل رقبہ فارم اور باغ کا ملا کے کوئی پچاس بیگھہ جریبی ہے۔ اس قطعۂ زمین کے چاروں طرف ایک بلند زمین چھوٹی سی پہاڑی کے سلسلے کے مثل ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے گویا رقبہ اس پہاڑی کی گھاٹی ہے۔ اس بلند زمین کے اس طرف ایک بہت بڑی جھیل ہے جس کا ایک حصہ پہاڑی کو کاٹ کے اس طرف نکل آیا ہے۔ باغ اس جھیل کے پانی کی سطح سے کچھ اونچا ہے۔ فارم اور باغ کے چاروں طرف بلند کھائی اور خندق ہے۔ اس کھائی پر ایک قطار گھیکوار کی ہے اور دوسری طرف قطار ببول کے پودوں کی ہے۔ اسی کے شمالی رُخ پر ایک طولانی تختہ باغ کا ہے۔ اس کے ایک قطعہ میں تخمی اور دوسرے میں قلمی آموں کے درخت ہیں۔ پھر ترشادہ کا مختصر ساتختہ

ہے۔ اس سے ملا ہوا پھولوں کا وسیع چمن ہے۔ اس کی سجاوٹ بالکل فطری طور پر مرزا کی طبیعت کی سادگی اور فطرت پسندی کا مذاق اس سے ظاہر ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی اس چمن کو دیکھے تو یہ ہرگز نہیں کہہ سکتا کہ یہ درخت یہاں لاکر لگائے گئے ہیں بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ سے آپ اُگے ہوئے ہیں۔ اسی چمن میں ایک پکی نالی پانی کی جھیل سے کاٹ کر لائی گئی ہے۔ اس نالی میں کنکر کٹے ہوئے ہیں جس سے صاف پانی بہتا ہے۔ نالی کے کنارے کنارے دوب اس خوبصورتی سے جمائی گئی ہے کہ اس کی شاخوں نے اکثر پانی کی سطح پر سایہ کر لیا ہے۔ چمن بندی ہموار تختہ پر نہیں ہے۔ زمین پہلے ہموار تھی مگر اسے اصلی پہاڑی زمین کا نمونہ بنایا ہے۔ اس میں جا بجا کنکھروں کی پہاڑیاں بنائی گئی ہیں۔ وہ بالکل اصلی معلوم ہوتی ہیں۔ بعض مشہور پہاڑی مقام کی نقل مرزا نے بالکل پیمانے سے ناپ کر بنائی ہے۔ زمین مزروعہ کا قطعہ بہت بڑا اور بالکل ہموار ہے۔ یہ قطعہ زمین کا بارہ مہینے سرسبز رہتا ہے۔ پانی کے برہوں کے کنارے تک بے کار نہیں چھوڑے۔ کوئی نہ کوئی شئے ہر فصل کے موافق ہر جگہ بوئی جاتی ہے۔ مرزا عابد حسین کی سوانح عمری تمام نہیں ہو سکتی جب تک ان کے بعض خطوط جو ہم نے بڑی مشکل سے فراہم کیے ہیں۔ مع ان خطوں کے جن کے جواب میں وہ لکھے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ شامل نہ کریں۔ ہم اس کتاب کے ساتھ ان کا فوٹو بھی ضرور شائع کرتے مگر اس کی ہمیں اجازت نہیں ہے۔ لیکن ہم اس موقع پر ان کے شمائلِ ظاہری کا ایک نقشہ بذریعہ الفاظ کھینچے دیتے ہیں۔ اس موقع پر ہم مرزا صاحب کو گویا اپنے ناظرین سے بالمشاہدہ تعارف کرائے دیتے ہیں۔

مرزا عابد حسین کا سن شریف اب تقریباً پچاس سال کا ہے مگر دمنع احتیاط اور جفاکشی کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ بالکل نوجوان معلوم ہوتے ہیں۔ گندمی رنگ ہے، میانہ قد، چوڑی ہڈی، زبردست کلائیاں، مضبوط ہاتھ، ان کو ایک نظر دیکھنے سے ایسا معلوم ہوگا کہ ان کے ہر عضو میں قوت بھری ہوئی ہے۔ جب وہ کسی جسمانی محنت کا ارادہ کرتے ہیں، ان کے شوق اور طرزِ آمادگی سے ایسا ظاہر ہوتا ہے جیسے کوئی بچہ کھیل کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ رفتار ان کی کسی قدر سریع ہے۔ ان کی ہیئت کذائی سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان کو بہت کچھ کام کرنا ہے۔ ہم دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان کو کسی نے کسی حالت میں اور کسی وقت میں بے کار نہ دیکھا ہوگا۔

بیٹے کا خط باپ کے نام۔ انٹرنس پاس کرنے کے موقع پر

قبلۂ من۔ مدظلہٗ۔ آداب و تسلیمات کے بعد گذارش یہ ہے کہ خدا کے فضل اور آپ کی دعا سے میں انٹرنس کے امتحان میں کامیاب ہوگیا۔ ایف۔ اے۔ کے لیے میں نے یہ مضامین پسند کیے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو انھیں اختیار کروں۔

انگریزی، ریاضی، سائنس، منطق، پولیٹکل اکانمی، ریاضی، علمِ حساب، الجبرا، علم ہندسہ مقالہ ششم و یازدہم، علم مثلث، کانک سکشن، سائنس،

علم طبیعات و کیمسٹری۔

ایف۔اے۔ کی ریاضی بہت مشکل ہے۔ اکثر طالب علموں نے یہ ضروری کورس نہیں لیا۔ مسلمانوں میں سے صرف میں نے یہ کورس لیا ہے۔

بعض دوستوں نے بہ لحاظ سہولت یہ رائے دی تھی کہ فارسی لے لوں۔ مگر میں نے اس لیے پسند نہ کیا کہ کورس کی کتابوں میں سے اکثر میری دیکھی ہوئی ہیں۔ سال بھر تک اُن ہی کو اُلٹ پھیر کر پڑھنے سے دل اکتا جائے گا۔ دوسرے ان کتابوں میں کوئی ایسی بات نہیں معلوم ہوتی جو سیکھنے کے لایق ہو۔ اگر میں سائنس نہ لیتا تو عربی لیتا۔ مگر جانتا تھا کہ سائنس کے لیے اکثر آپ تاکید فرماتے رہے ہیں۔ اس لیے میں نے اسی کو ترجیح دی۔ اور واقعی مجھ کو سائنس کے پڑھنے کا ذاتی شوق ہے۔ اکثر طالب علموں کا ارادہ لا کلاس میں نام لکھوانے کا ہے۔ میں آج کل منطق کی کتاب کو بجائے خود پڑھ رہا ہوں۔ جو رسالے منطق کے آپ نے گھر پر پڑھا دیے تھے ان سے بہت مدد ملی۔ پولیٹکل اِکانمی ایک نیا مضمون ہے مگر دلچسپی سے خالی نہیں۔

جناب والدہ صاحبہ کو تسلیم اور سب کو درجہ بدرجہ سلام و دُعا۔

عرض دیگر یہ ہے کہ مالی سے تاکید کر دیجیے گا کہ میرے پھولوں کے ناندوں کی اچھی طرح خبرگیری کرے مجھے خوف ہے کہ وہ بعض اوقات لاپروائی کر جاتا ہے۔

عریضہ فدوی باقر

۱۔ خط عابد حسین کا اپنے بڑے بیٹے کے نام

باقر حسین زاد قدرہٗ۔ بعد دعا کے معلوم ہو کہ مجھے تمہارے انٹرنس پاس کرنے کا حال گزٹ سرکاری سے معلوم ہو گیا تھا اور میں تمہیں اس موقع پر مبارک باد کا خط لکھنے والا تھا کہ تمہارا خط آیا۔ مجھے اس بات کے معلوم ہونے سے بڑی خوشی ہوئی کہ تم نے ابھی سے ایف۔ اے۔ کے امتحان کی تیاری کر دی۔ انتخاب مضامین کے بارے میں اچھا کیا تم نے مجھ سے رائے طلب کر لی۔

انگریزی اور ریاضی بہت ضروری مضمون ہیں۔ ان کے بارے میں تو کچھ کہنا ہی نہیں ہے۔ شاید ایف۔ اے۔ کی ریاضی میں یہ مضامین ہیں۔ علمِ حساب کامل مع علمِ حساب نظری۔ جبر و مقابلہ۔ ہندسہ چھٹا مقالہ مع گیارہویں مقالے کے اور اول کے چار مقالوں پر نظرِ ثانی۔ قطاع مخروطات بحثِ متناقص جسے بیضوی کہتے ہیں اور مکافی یعنی پیرابولہ۔ شاید متزائد کی بحث ایف۔ اے۔ میں چھوڑ دی گئی ہے۔ میں بہت خوش ہوتا اگر وہ بھی شامل ہوتی۔ مگر میں تم سے فرمائش کرتا ہوں کہ متزائد (یعنی ہائپربولہ) کی بحث بجائے خود دیکھ جانا۔ علمِ مثلث سطحی اور اس کے ساتھ لوگارتم کا استعمال بہت ہی کارآمد ہے۔ ایک کتاب عمدہ چیمبرس میتھمیٹکل ٹیبلس کی میں بطور انعام تم کو روانہ کرتا ہوں۔ اس کتاب سے تم کو ریاضیات کے عمل میں بہت مدد ملے گی۔ اسٹاٹیکس پر خاص توجہ کرنا۔ اس علم کی ملک کو اور قوم کو سخت ضرورت ہے۔ گرمیوں کی تعطیل میں گھر آ دگے تو کلوں کے نمونے میرے

ہاتھ کے بنائے ہوئے دیکھنا۔ ان کے فائدے اور استعمال کے طریقے میں تمہیں عملی طور سے بتاؤں گا۔

ایک غلط مقولہ آج کل بہت مشہور ہو گیا ہے۔ کیا عجب ہے کہ تم نے بھی سنا ہو کہ مسلمانوں کا دماغ ریاضی کی تحصیل کے ناقابل ہے۔ میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ اس بات کی کوئی اصل نہیں ہے۔ جب تم منطق پڑھو گے تو تم کو معلوم ہو گا کہ یہ مقولہ منجملہ استقرائیات ناقص ہے اور استقراء ناقص علم اور یقین کے لیے مفید نہیں۔ اگلے مسلمانوں نے خاص اسی علم ریاضی میں بہت کچھ کر دکھایا ہے۔ تم کو معلوم ہو کہ اگلے نظام تعلیمی میں پندرہ مقالے اقلیدس کے ابتدائی درس میں اور تیس مقالے متوسطات کے درس اوسط میں داخل تھے اور اس کے بعد مجسطی پڑھائی جاتی تھی۔ یہ کتاب نظام بطلیموس علم ہیئت کے بیان میں ہے۔ اگرچہ نظام بطلیموس اب غلط ثابت ہوا لیکن یہی کتاب ایک زمانے میں تمام علمائے ہیئت کی مسند الیہ تھی اور مجسطی پہلے پہل عربی سے لاطینی زبان میں ترجمہ ہوئی جس سے تمام یورپ نے علم ہیئت سیکھا اور مجسطی کے مثل اور کتابیں بھی عربی سے یورپی زبانوں میں ترجمہ ہوئی ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمان علم ہیئت میں بھی اہل یورپ کے استاد ہیں اور اس سے علمائے یورپ کو انکار نہیں ہو سکتا۔ یہ کتابیں جن کا ذکر کیا گیا ہے خود میرے کتب خانہ میں موجود ہیں اور ام۔ اے۔ کورس سے کسی طرح کم پایہ نہیں ہیں۔ فارسی ایف۔ اے۔ میں نہ لینا تمہارے لیے بہت مناسب بلکہ ضروری تھا۔ یہ جو تم نے لکھا ہے کہ اگر میں سائنس نہ لیتا تو عربی ضرور لیتا۔ جب تم نے خود ہی سائنس کو ترجیح دے کر اختیار کیا تو اب مجھے کچھ کہنا نہیں ہے۔ میں ہمیشہ تم کو سمجھا یا کیا ہوں کہ مدرسوں کی پڑھائی اور

امتحانوں کی کامیابی تحصیل علم کا مقصود نہیں ہے بلکہ اس سے ایک حیثیت اظہارِ لیاقت کی اور ایک ملکہ تحصیلِ علم کا حاصل ہو جاتا ہے۔ اگر تم کو عربی پڑھنے کا شوق ہے تو بی۔اے۔پاس کرنے کے بعد بجائے خود پڑھ لینا۔یہ عام مقولہ مشہورات سے ہے کہ عربی، فارسی، انگریزی اسکول میں نہیں آتی کیوں کہ مکتبوں اور مدرسوں میں مقصود بالذات انگریزی ہے نہ کہ عربی۔ فارسی تو کوئی ایسی چیز نہیں۔ لیکن عربی کا علم ادب اور پھر معقولات و منقولات وغیرہ ملا کے بہت ہی وسیع لٹریچر ہو جاتا ہے جس کے لیے ایک عمر مطالعہ اور خواندگی کی ضرورت ہے۔ میں ہرگز کسی ہندو یا مسلمان نوجوان طالب علم کو یہ رائے نہ دوں گا کہ وہ مدرسہ کی تعلیم کا وقت جو نہایت ہی محدود اور بیش قیمت ہے، فارسی یا عربی و سنسکرت کے پڑھنے میں ضائع کرے۔ اس کے چند وجوہ ہیں۔

(۱) ان زبانوں کے پڑھنے یا علوم حاصل کرنے سے قومی حیثیت اور مذہب کا حفظ اور بقا اگر منظور ہے تو وہ اس قسم کی پڑھائی سے جو مدرسوں میں ہوتی ہے حاصل نہیں ہو سکتا۔

(۲) تکمیل کا درجہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ کتابوں کا انتخاب اس قسم کا ہوتا ہے کہ ان کو انگریزی کتابوں کے ساتھ ہی ساتھ پڑھنے سے ایک قسم کا تنفر اپنے علوم سے پیدا ہو اور کوئی نفع ہو نہیں سکتا۔ مثلاً جو طلبہ ایسی عمدہ کتابیں جیسے ملیکی کی کتاب سلف کلچر، ہکسلی کی کتاب کے سرمنس یا ہلپ کی کتاب اسیز وغیرہ پڑھتا ہو اس کے سامنے وہ کتابیں جو لغو مبالغات اور جھوٹی خوشامدوں سے بھری ہوئی ہیں، ان کی کیا وقعت ہو سکتی ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ نصاب تعلیم کے انتخاب کے وقت ممبران کمیٹی فارسی اور عربی کی عمدہ کتابوں کے نام کیوں

بھول جاتے ہیں۔ کیا فارسی اور عربی میں صرف اتنی ہی کتابیں ہیں جن کا انتخاب اکثر نصاب ہائے تعلیم میں دیکھا گیا ہے۔

میرا ارادہ ہے کہ ایف۔ اے۔ کے پاس کرنے کے بعد تم سے بجائے بی۔ اے۔ کے بی۔ ایس۔ سی۔ کا امتحان دلواؤں گا اور انشاء اللہ اس کی کامیابی کے بعد تمہاری تعلیم گھر پر ہوگی۔ کہیں اور طالب علموں کی دیکھا دیکھی تم لا کلاس میں نام نہ لکھوا لینا اور اگر ایسا کرنا بھی تو صرف علم حاصل کرنے کے لیے نہ اس غرض سے کہ وکالت کا امتحان دے کر اس کو ایک ذریعہ اخذِ معاش کا قرار دو۔ میرا یہ مقصد نہیں ہے کہ وکالت کا پیشہ برا ہے یا اس پیشے کے لوگ دیانت دار نہیں ہوتے جیسا کہ مشہور ہے مگر اس میں بھی شک نہیں کہ وکالت کے پیشہ میں افراط و تفریط کی ترغیبیں بے شمار ہیں اور احتیاط دشوار۔ غرض کہ خطرناک ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ بہرصورت اسلم یہی ہے کہ اس اندیشہ ناک راستے سے درگذرو۔

علاوہ اس کے ملک کو اس کی ضرورت بہت کم ہے۔ ہزارہا وکیل اور بیرسٹرایٹ لا خدا کے فضل سے موجود ہیں۔ اُن علوم کا حاصل کرنا واجب کفائی بلکہ بعض صورتوں میں واجب عینی ہے جس کے جاننے والے قوم میں کم ہیں اور جس کی قوم اور ملک کو از حد ضرورت ہے۔

میں نے سنا ہے کہ تمہارے مدرسے میں علم ہیئت کا کوئی امتحان مقرر ہوا ہے۔ میں اس کو سُن کے بہت ہی خوش ہوا۔ اس علم میں ہمارے بزرگوں نے بہت محنت کی تھی جس کا ثبوت علمِ ہیئت کی بسوط تاریخوں سے مل سکتا ہے۔ اس وقت میری میز پر ایک کتاب علم ہیئت کی مع ایک مختصر فرہنگ انگریزی زبان میں موجود ہے۔ ردیف الف میں ال (عربی حرف تعریف)

سے جو لفظیں شروع ہوتی ہیں، ان کا شمار پچاس کے قریب ہے اور عربی الاصل الفاظ کا ذکر نہیں۔ اگر تمہارے درجے کے طالب علم ہیئت کے کلاس میں داخل ہونے کے مجاز ہوں تو تم بھی ضرور نام لکھوا دو اور اس کے کورس کی کتابوں کے نام مجھ کو لکھ کر بھیج دو۔ جو کتابیں میرے کتب خانہ میں موجود ہیں میں بھیج دوں گا باقی کلکتہ سے منگوا لینا۔ گرمیوں کی تعطیل میں ہم تمہیں وہ آلات علم ہیئت کے دکھائیں گے جو ہم نے اپنے ہاتھ سے بنائے ہیں اور وقتاً فوقتاً ان مشاہدات کا بھی تذکرہ کریں گے جو اُن سے ہو سکتے ہیں۔

رقیمۂ دُعاء عابدؔ از دہلی۔ ۲۱ر جون ۱۸۸۹ء

مخدوم بندہ جناب مرزا صاحب تسلیم! میں نے خارجاً سنا ہے کہ آپ نے اس زمانے میں کوئی کتاب جبر ثقیل میں عربی زبان سے اردو میں ترجمہ کی ہے۔ اگر وہ کتاب چھپ گئی ہو تو اس کا ایک نسخہ مجھ کو بھیج دیجیے اور اگر نہ چھپی ہو تو کسی اوسط درجے کے کاتب سے لکھوا کر روانہ فرمائیے۔ میں بہت ہی ممنون ہوں گا۔ اتنا ادب کے ساتھ اور عرض کرنا چاہتا ہوں کہ فی زمانہ اس علم میں بہت ترقی ہوئی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ کی ہر تصنیف کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ اگر آپ کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ فرماتے تو شاید قوم اور ملک کے لیے زیادہ مفید ہوتا۔

آپ کا نیاز مند قدیم۔ ظہور الدین۔ ایم۔ اے۔

قدر دان بندہ مولوی ظہور الدین صاحب ایم۔ اے۔ دہلوی تسلیم!

بجواب آپ کے عنایت نامہ مورخہ ۲۱ر جون ماہ و سنہ حال عارض مدعا

ہوں۔ میں نے واقعی ایک رسالہ جرِ ثقیل عملی کا جس کے دیباچہ میں مصنف نے اپنا نام ابوعلی لکھا ہے، فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس رسالے کی تصنیف سے قوم کو جرِ ثقیل عملی کا سکھانا منظور نہیں ہے۔ اس مطلب کے لیے بقول آپ کے کوئی کتاب انگریزی کی ترجمہ کرنا ضروری ہے بلکہ اس ترجمے سے دو مقصد ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایک ہونہار نوجوان طالب علموں کی نگاہ میں قومی وقعت کا قائم رکھنا منظور ہے جس کی میرے نزدیک اس زمانے میں اشد ضرورت ہے، دوسرے ایک امر اور اس کتاب کے ترجمے کا مقتضی ہوا وہ یہ کہ میکانات بسیط جن کا ذکر اس مختصر رسالے میں ہے بعینہٖ وہی ہیں جو اس زمانے کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں مثلاً محو، بیرم، دولاب، لولب، الفین وغیرہ۔ اس عملی رسالہ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ بُرہانی طور سے یہ علم اُسی زمانے میں ایک حدتک ترقی کر چکا تھا۔ افسوس کوئی کتاب بُرہانی دستیاب نہیں ہوئی۔ حسب الحکم آپ کے ایک نقل رسالہ مطلوبہ کی روانہ کرتا ہوں، اگر دہلی میں کوئی کارخانہ اس کتاب کے چھاپنے کا ذمہ لے تو بے تکلف بلا تعیّن حق تالیف دیدیجیے گا۔

ایک خوشخبری آپ کو اور سناتا ہوں کہ ایک نسخہ محقق طوسی کی اُقلیدس کا جس میں پورے پندرہ مقالے مع حواشی اور تعلیقات وغیرہ کے ہیں، مجھ کو دستیاب ہوگیا ہے۔ میرا مصمم ارادہ ہے کہ اس کو بجنسہٖ چھپوا دوں۔ کیا اچھا ہوتا اگر یہ کتاب اردو انگریزی دونوں زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع کی جاتی۔ مگر افسوس کہ مجھ کو زمانہ مہلت نہیں دیتا۔ اور کوئی صاحب اس بار کو اپنے ذمہ نہیں لیتے۔ باقر نے بی۔ ایس۔ سی۔ کا امتحان ماشاءاللہ پاس کرلیا مگر وہ ابھی عربی زبان کے اصطلاحات علمی سے نابلد ہے ورنہ اس کو اس کام میں اپنا شریک کرلیتا۔ باقر نے میرے کہنے سے وکالت کے امتحان کی کوشش نہیں کی اور نہ اُسے شغل اور حوصلہ مند نوجوانوں کے

نوکری کی فکر ہے۔ امید ہے کہ علمی مقاصد میں وہ معین ہوگا۔ بالفعل اسی غرض سے میں نے اس کو عربی معقولات پڑھانا شروع کیا ہے۔ الشیٔ منی و الاتمام من اللہ۔

دہلی میں ایک صاحب میر احسان علی نامی کشمیری دروازے کے قریب تشریف رکھتے ہیں۔ اُن کے آبا و اجداد علوم ریاضیہ میں اپنے عہد کے کاملین شمار کیے جاتے تھے۔ جب میں دہلی گیا تو بالتخصیص ان سے ملا تھا۔ بیچارے بہت پریشان حال تھے۔ ان کے پاس ایک اسطرلاب جس کا قطر دس انچ تھا۔ لاہور کی بنی ہوئی نہایت ہی عمدہ تھی اور وہ اسے بیچتے تھے۔ پانچ سو روپیہ قیمت کہتے تھے۔ افسوس! اس وقت میرے پاس روپیہ نہ تھا۔ آپ براہ عنایت ان سے دریافت کیجیے۔ اگر وہ اب تک نہ بکی ہو تو میرے واسطے خرید لیجیے۔

آپ کے چچا مولوی ریاض الدین صاحب ان سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اس لیے آپ کو ان کی تلاش کرنے میں دقت نہ ہوگی۔

نیاز کیش عابد

مرزا... ب معظم بندہ تسلیم! رسالہ مرسلہ پہنچا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ رسالہ آپ کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ مجھے اس کا فخر حاصل ہوا کہ ایک کتاب آپ کے دستخط خاص سے میرے کتب خانہ میں شامل ہوئی۔ مگر آپ نے کیوں تکلیف کی، کسی سے لکھوا دیا ہوتا۔ واقعی کیا عمدہ رسالہ ہے اور ترجمہ کا حق آپ نے خوب ادا کیا ہے اور کچھ لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ اس لیے کہ آپ زیادہ تعریف کو پسند نہیں فرماتے اگرچہ وہ امر حق ہی کیوں نہ ہو۔

چچا جان سے دریافت کر کے میں خود میر احسان علی کے مکان پر گیا تھا۔

بالفعل وہ پٹیالہ میں ہیں مگر ان کے صاحبزادے کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ اسطرلاب ایک صاحب جرمنی سے آئے تھے وہ سات سو روپیہ کو خرید لے گئے۔

اس بات کے دریافت ہونے سے مجھ کو کچھ زیادہ افسوس نہیں ہوا۔ اس لیے کہ میں خوب جانتا ہوں کہ آپ اصولِ علوم سے باخبر ہیں اور میں جب لکھنؤ گیا تھا تو آپ کے ہاتھ کا بنا ہوا اسطرلاب خود دیکھا تھا۔ میرا اعتقاد مجھے یقین دلاتا ہے کہ میر احسان علی والا اسطرلاب اس سے کسی طرح بہتر نہ ہوگا۔ بالفعل آپ کے پانچ سو روپیہ کی بچت ہو گئی ورنہ مجھ کو تعمیلِ ارشاد ضروری کرنا ہوتی اور پانچ سو روپیہ آپ کے بلاضرورت صَرف ہو جاتے۔ محقق طوسی کی اقلیدس محشی کے دیکھنے کا میں بھی مشتاق ہوں۔ ممکن ہو تو اسے چھپوا دیجیے۔ بھائی باقر حسین سلمہٗ کے امتحان میں پاس ہونے کی خبر مجھے ان کے خط سے معلوم ہو چکی تھی اور ان کو میں مبارک باد بھی دے چکا ہوں۔ آپ کی تحریر سے معلوم ہوا کہ آپ اپنے مثل ان کو بھی تارک الدنیا بنانا چاہتے ہیں مگر یہ نہیں معلوم ہوا کہ ان کا ذاتی منشاء کیا ہے۔ کیا وہ اپنی آئندہ زندگی کو ملک اور قوم پر نثار کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ اگر ایسا کیا تو بہت بُرا کیا۔ چچا جان کی طرف سے آپ کو سلامِ شوق لکھ کر اس عریضہ کو ختم کرتا ہوں۔ فقط

عقیدت آئین

ظہور الدین

عنایت فرمائے بیکراں جناب مرزا صاحب دام مجدہٗ تسلیم!

یہاں بہ ہمہ وجوہ خیریت ہے اور آپ کی خیر و عافیت کا درگاہِ قاضی الحاجات سے شب و روز نیک مستدعی رہتا ہوں دریں و لاباعثِ تحریر نیاز نامۂ ہٰذا یہ ہے

کہ نورِ چشمی۔ ۔ ۔ ۔ کی تقریب کتخدائی ہونے والی ہے۔ اس کے واسطے کچھ اسباب تو پہلے سے موجود ہے اور کچھ اسباب خریدنا ہے حسین الدین کی والدہ نے کل شب کو یہ صلاح دی کہ مرزا صاحب بالفعل لکھنؤ میں تشریف رکھتے ہیں۔ جو کچھ خریدنا ہے ان کو لکھ بھیجو، وہ خرید کرا کے بھیج دیں۔ اگرچہ مجھے معلوم تھا کہ آپ لکھنؤ میں ہیں مگر یہ خیال کبھی نہ آیا تھا کہ آپ کو اس بابِ خاص میں تکلیف دوں۔ بہر صورت ایک فہرست اسباب خریدنی ملفوف خط ہذا ہے۔ اس کے موافق کسی آدمِ معتبر کی معرفت خرید کر کے بذریعہ ریلوے بہت جلد روانہ فرمائیے کہ عین احسان ہوگا۔ خدا کرے کہ آپ شادی کے وقت تک یہاں آ جائیں تو اس کارِ خیر میں مجھ کو آپ سے بہت مدد ملے گی۔ یہ بھی اطلاعاً گذارش کیا جاتا ہے کہ نورِ چشمی کی شادی کا جہاں سے پہلے پیام ہوا تھا اور پھر بعد، کچھ جھگڑے نکل آئے تھے وہیں تقرر ہو گیا۔ حسین الدین کی والدہ کچھ زیادہ خوش نہیں ہیں مگر قومیت کے لحاظ سے میں راضی ہو گیا۔

حسین الدین کی والدہ کا یہ بھی خیال تھا کہ اسباب جہیز وغیرہ کے خریدنے کی کیا ضرورت ہے اور لڑکے کے والدین بھی اسی بات پر زور دیتے ہیں کہ نقد دیدیا جائے مگر میری رائے ہے کہ جب دینا ہی ہے تو نام کر کے کیوں نہ دیا جائے۔ چار اپنے پرایوں کو بھی معلوم ہو جائے کہ کیا کیا دیا گیا اور روپیوں کی تھیلیاں یا نوٹ اگر چپکے سے دیئے گئے تو اسے کون جانے گا۔

رجب آیندہ کی اوائل تاریخوں میں، شادی سے فراغت ہو جائے گی۔ خیر، مرزا صاحب خدا نے اس فرض سے بھی ادا کیا۔ سب چھوٹے بڑوں کی طرف سے دعا، بندگی، سلام قبول ہو۔

مکرر عرض یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے آپ کا آنا نہ ہو سکے تو عزیزی باقر حسین اور بشرطِ امکان ان کی والدہ کو ضرور روانہ کر دیجیے گا ورنہ شکایت ہوگی بلکہ میں

تو کہتا ہوں کہ اگر آپ اس موقع پر تشریف رکھتے ہوتے تو بہت بہتر تھا۔
فقط
راقم ہدایت حسین پیشکار

سیّد صاحب من تسلیم۔ مبارک باد! عنایت نامہ آپ کا آیا۔ اگرچہ شادی بیاہ کے موقع پر کوئی امر و صلہ متد ماں باپ کے خلافِ طبیعت لکھنا اکثر ناگوار ہوتا ہے۔ لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ ہر شخص اپنی آزاد رائے کے ظاہر کرنے پر کسی طرح منع نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کے خط سے معلوم ہوا کہ دو امروں میں مابین آپ کی رائے اور حسین الدین سلمۂ کی والدہ یعنی آپ کے اہلِ خانہ کی رائے کے اختلاف ہے اور دونوں امروں میں حق آپ کی بیوی کی طرف ہے۔ مگر کچھ لکھتے نہیں بن پڑتا۔ اگر شادی کا تقرر ہو گیا اور معاہدے طرفین سے طے پا گئے تو اب یہ لکھنا فضول ہے کہ آپ نے اچھا نہ کیا۔ ماشاء اللہ صاجزادی آپ کی خواندہ اور نہایت ہی سلیم الطبع ہے اور وہ نوجوان جو آپ کا داماد ہونے والا ہے، میں نے سنا ہے (خدا کرے جھوٹ ہو) الف کے نام سے بھی نہیں جانتا۔ قومیت کے باب میں ہر کہ شک آرد کافر گردد۔ مگر جناب اگر لڑکی کی عافیت منظور تھی تو اس جاہلانہ قومیت کے خیال کو چولھے میں ڈالا ہوتا۔ اب مجبوراً یہ مجھے اور میرے مثل آپ کے اور دل سوز دوستوں کو یہ کہنا ہی پڑے گا۔ الخیر فی ما وقع۔

یہ جو آپ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ اگرچہ لڑکا جاہل ہے لیکن نہایت ہی غریب اور کم سخن ہے۔ اس کا میں قائل نہیں۔ اس لیے کہ آپ کو اس کا تجربہ کس طرح ہوا؟ اور اگر ہوا بھی تو وہ غلط اصول پر مبنی ہے۔ سونا جانے کسے اور آدمی

جانے بسے۔ جناب وہ لڑکا جب آپ کے مکان پر بطور دکھوے کے آیا ہوگا تو کیا
آپ سے اسی وقت گالی گلوج کرتا یا مشت مشت کرتا تو آپ کو اس کی جاہلیت کا یقین
ہوتا۔ جاہل سے سوائے جاہلیت کے اور کس بات کی توقع ہوسکتی ہے۔ بہرصورت
جو کچھ آپ نے کیا میں تو اسے کبھی اچھا نہ کہوں گا۔ مگر ہر کسے مصلحتِ خویش نکو میداند۔
دوسرا امر یہ ہے کہ بھابی صاحبہ کی رائے بہت ٹھیک ہے کہ نقد روپیہ
دے دیا جائے۔ افسوس ہے کہ آپ ایسے لائق خواندہ شخص کے ایسے پست
خیالات ہوں۔ اوّل تو نام کا خیال ہی لغو ہے اور اگر بالفرض ہو بھی تو اپنے
ضلع کے کسی لوکل اخبار میں چھپوا دیجیے یا مجھ کو اجازت دیجیے میں چھپوا دوں گا
کہ میر ہدایت حسین صاحب پیشکار نے اپنی بیٹی کے جہیز میں پانچ ہزار روپئے دیئے
نقد روپیہ دینے میں ایک کتنا بڑا یہ نفع ہے کہ اگر داماد آپ کا بخیال آپ کے
سلیم الطبع اور نیک نفس ہے تو ایک سرمایہ اس کے پاس مہیا ہو جائے گا جس
سے وہ کسی قسم کی تجارت کرلے گا۔ زیور وغیرہ کے دینے کو میں چنداں برا نہیں
خیال کرتا۔ اس لیے کہ اس میں نقصان کم ہے۔ مگر یہ چکلہ ٹھیکے کے کپڑے، تانبے
کے برتن، پلنگ، پیڑھی اور تمام اسباب جس کی بالفعل کوئی ضرورت نہیں ہے،
سوائے داموں پر خرید کرکے لڑکی کے ساتھ کر دینے میں کیا ایسی رسوخیت ہے۔
اگر خدانخواستہ لڑکے والے اس قدر محتاج ہیں کہ ان کے چولھے پر توا تک نہیں ہے۔
اس صورت میں البتہ تھوڑا سا اسباب حسبِ ضرورت دے دیجیے تاکہ
آپ کی خوشی ہو جائے ورنہ میں تو اس کی بھی رائے نہ دوں گا۔ لڑکا یا اس کے
والدین حسبِ ضرورت خرید کرلیں گے۔
قطع نظر فرضِ انسانی اور اخوتِ اسلامی کے مجھ کو آپ سے محبت ہے۔
اس لیے یہ چند کلمے بطور نصیحت اپنا فرض سمجھ کے لکھ دیے ہیں۔ ابھی رجب کے

بہت دن باقی ہیں۔ امید کہ آپ ان اُمور پر کامل غور کر کے جواب تحریر فرمائیں گے۔ اگر میری رائے مقبول نہ ہو تو فہرست آپ کی میں نے احتیاط سے صندوقچے میں رکھ چھوڑی ہے۔ اسی فہرست کے مطابق یا اگر کچھ ترمیم کیجیے یا فہرست ترمیم شدہ کے بموجب کل اسباب میں اپنے ہاتھوں حتی الامکان نہایت کفایت سے خرید کر کے روانہ کر دوں گا۔ اور ہاں خوب یاد آیا۔ میں افسوس کے ساتھ لکھتا ہوں کہ میری اور والدۂ باقر حسین کی شرکت اس تقریب میں نہیں ہو سکتی اور نہ میں اس کی ضرورت سمجھتا ہوں۔ عزیزی باقر حسین کو آپ کی خوشی کے لیے ضرور بھیج دیتا مگر وہ آج کل میرے ساتھ علم الاعجاز کی ایک معتبر کتاب کے ترجمہ کرنے میں مصروف ہے۔

میر صاحب! میری صاف گوئی سے خفا نہ ہو جائیے گا۔ میرے خط کے ہر فقرے کو کم از کم دو بار پڑھیے اور اس کے نتائج پر غور کیجیے۔ باوجود علم و فضل کے بھی انسان اگر اپنے اور اپنے متعلقین اور اپنے احباب کی برائی بھلائی پر نظر نہ رکھے تو حیف ہے۔

بھابی صاحبہ کو سلام اور بچوں کو دُعا۔

رقیمۂ خاکسار۔ عابد

جناب مرزا صاحب معظّم بندہ دام مجدکم۔ تسلیم! آپ کے خط کا ایک ایک فقرہ موتیوں میں تولنے کے قابل ہے اور جو کچھ آپ نے لکھا ہے اس کی حقیقت کو میں خوب سمجھے ہوئے ہوں مگر بعض وجوہ سے میں مجبور ہوں اور میں اس کے ہر نقطہ پر عمل کرتا مگر ہم چشموں خصوصاً عزیزوں کی طعنہ زنی کا خیال مجھے مجبور کیے دیتا ہے۔ بہر صورت میں نے فہرست اسباب میں بہت ترمیم کر دی ہے

لڑکے کے ماں باپ بہت متموّل ہیں۔ شاید اس کی نوبت نہ آئے کہ کسی دکان یا کارخانہ کرنے کی بالفعل ضرورت ہو، اور ان لوگوں کی یہ ظاہر یہی خوشی معلوم ہوتی ہے کہ حسب معمول جہیز دیا جائے کیوں کہ اُدھر برات وغیرہ کی تیاریاں بہت دھوم دھام سے ہوں گی۔ وہ لوگ چاہتے ہیں کہ اسی تیاری کی حیثیت کے موافق اِدھر بھی سامان کیا جائے۔

اس شادی میں شریک نہ ہونے کا مجھے ملال ہوا۔ اسباب بہت جلد روانہ فرمائیے۔

نیازمند
ہدآیت حسین

میر صاحب من۔ تسلیم! آپ کا خط آیا۔ فہرست ترمیم شدہ اور پہلی فہرست کو میں نے ملا کر دیکھا۔ صرف سَو، سوا سو روپئے کا فرق ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ میرے خط کا ہر لفظ موتیوں میں تولنے کے لائق ہے۔ اگر میں بھی آپ کی طرح عبارت آرائی جانتا ہوتا تو اس قدر دانی کے موتیوں سے زیادہ کسی قیمتی چیز سے مثال دے کے شکریہ ادا کرتا۔ آپ کہتے ہیں کہ لفظ لفظ موتیوں میں تولنے کے لائق ہے مگر افسوس کہ آپ نے اسے ٹھیکریوں میں بھی نہ تولا۔ اس لیے کہ علم کی قدر عمل یعنی نصیحت کی قدر اس پر کاربند ہوتا ہے میر صاحب! آخر آپ نے اپنی ضد کی۔ کچھ آپ پر موقوف نہیں۔ تمام قوم تقلید کے دام میں پھنسی ہوئی ہے۔ امرِ غیر معقول پر کسی کی طعنہ زنی کا خیال یعنی چہ؟ اسی موقع کے لیے کسی استاد کامل نے یہ بھدّی سی مثل کہی ہے۔ "جس نے کی شرم اس کے پھوٹے کرم"۔ میر صاحب! میں سچ کہتا ہوں کہ اس غلطی میں اگر صرف آپ کی ذاتِ

خاص کام نہ ہوتا تو مجھے چنداں افسوس نہ ہوتا۔ حیف آپ اپنی ضعفِ طبیعت کی وجہ سے ایک ناکردہ گناہ معصوم بچی کو معرض خطر میں ڈالتے ہیں۔ آپ کے خط کی عبارت پڑھ کے عرب کی جاہلیت کا زمانہ اور بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ والا مضمون میری آنکھوں میں پھر گیا۔ لڑکی کو بے سمجھے بوجھے کہیں جھونک دینا زندہ دفن کر دینے سے بدتر ہے۔ مگر اب یہ افسوس بالکل بے موقع ہے۔ اسباب اسی ہفتہ خرید کر کے روانہ کرتا ہوں خاطر جمع رکھیے۔

نیاز مند
عابدؔ

مخدومی و مکرمی جناب مرزا صاحب دام برکاتکم تسلیم! آپ کے ایک دوست کی زبانی معلوم ہوا کہ آپ نے کوئی کتاب "روزانہ زندگی" کے نام سے تصنیف فرمائی ہے۔ اگر وہ چھپ گئی ہو تو ایک جلد اس کی مرحمت فرمائیے۔ ممنون ہوں گا۔

خادم
مہادیو پرشاد

جناب من۔ ابھی اس کتاب کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی اور شاید وہ کتاب کبھی نہ چھپ سکے۔

رقیمۂ نیاز
عابدؔ

معظمی جناب مرزا صاحب تسلیم۔ میں ایک مدت سے آپ کی تعریفیں سنا کرتا ہوں اور آپ کے خیالات کے معلوم کرنے کا مجھے کمال شوق ہے۔ آپ کے مختصر جواب نے مجھے بالکل مایوس کر دیا۔ ایک تو اس کا سبب تحریر فرمائیے کہ وہ کتاب کیوں نہ چھپے گی۔ دوسرے اگر کوئی کتاب آپ کی تصنیفات سے چھپ کر تیار ہو تو مجھ کو ضرور عنایت کیجیے۔

عریضۂ خادم - مہادیو پرشاد

جناب میری تصانیف سے جو کتابیں چھپی ہیں وہ سب علمی ہیں۔ فہرست کتب مطبوعہ کی روانہ کرتا ہوں۔ جو کتاب مطلوب ہو پبلشر کو خط لکھ کر منگوا لیجیے۔

"روزانہ زندگی" کے نہ چھاپنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ مختصر کتاب میں نے مرزا رسوا صاحب کی فرمایش سے لکھی تھی۔ وہ ان کے حوالہ کر دی۔ مرزا صاحب نے جو میری لائف تحریر فرمائی ہے اس میں اکثر مضامین اس رسالے کے موجود ہیں۔ کیوں کہ کتاب "روزانہ زندگی" کا تعلق بالتخصیص میری ذاتیات سے تھا جس کو میں نے سیدھے سادے لفظوں میں لکھ دیا تھا۔ مرزا صاحب نے اس کو شاعرانہ ستایش اور دوستانہ نوازش کے ساتھ خلط مبحث کر کے ایک عجیب چیز بنا دیا جس کو یا وہ خود سمجھ سکتے ہیں یا ایسے اصحاب جن کو ناول دیکھنے کا شوق ہے۔ خلاصہ یہ کہ میرے واقعات کو ایک دلچسپ فسانہ بنا دیا۔ میری پوری لائف کا خلاصہ یہ ہے کہ "میں ایک چلتی ہوئی کل ہوں جس کی کمانی ضرورت اور جس کی قوت مجبوری ہے۔" میں ایسا خیال کرتا ہوں کہ ہر انسان کی لائف کا یہی خلاصہ ہے۔ میری لائف میں میرے بعض رنج کے حالات ایسے لکھ دیے ہیں جن کا مشتہر کرنا شاید اور کوئی شخص گوارا نہ کرتا مگر مرزا صاحب کا خیال ہے کہ اس سے خلق اللہ کو فائدہ

پہنچے گا۔ اگر ایسا ہے اور میری آرزو ہے کہ ایسا ہو تو اس سے بہتر کیا بات ہے۔
زیادہ نیاز۔

آپ کا خادم۔ عابدؔ

بی۔ ایس۔ سی کا امتحان باقر نے مدرستہ العلوم علی گڑھ میں پاس کیا تھا۔ جب والد کو اپنی کامیابی کا حال لکھا۔ اس کے جواب میں جو خط مرزا صاحب نے اپنے لائق فرزند کو لکھا تھا اس کو بعینہٖ نقل کیے دیتے ہیں۔

عزیز از جانِ من مرزا باقر حسین سلمہٗ۔ بعد دعا کے معلوم ہو کہ تمہارے بی۔ ایس۔ سی۔ ڈگری کا امتحان پاس کرنے کا حال معلوم ہوا۔ اس موقع پر اگر میں خوشی نہ ظاہر کروں تو تم ناخوش ہو گے۔ اس لیے تمہاری خوشی کے لیے میں نے تمہارے نام کے ساتھ قبل اس کے کہ یونیورسٹی کے ہال سے تم گون پہنے ہوئے ڈپلوما ہاتھ میں لے کے نکلو، لفظ بی۔ ایس۔ سی۔ بھی تمہارے القاب میں بڑھا دیا اور خلاف معمول آج تمہارے نام کے پہلے لفظ مرزا بھی لکھا ہے۔ واقعی اب تم اس قومی اور خاندانی خطاب کے شایانِ شان ہو۔ میرے نزدیک اعلیٰ درجہ کی تعلیم شرافت کا تمغہ ہے جس سے میں زندگی میں نامساعدت زمانہ کی وجہ سے محروم رہا مگر یہ اچھی طرح یاد رکھنا کہ خالی شرافت کا تمغہ بھوک پیاس کی تسکین کے لیے کافی نہیں ہے۔ ہر ایک طبعی حاجت کے لیے طبعی مشقت ضروری ہے۔ اگر تمہارے لیے کوئی پانی نہ بھرے تو جب پیاس لگے گی تم ہی کو ڈول لے کے خود ہی کنویں پر جانا پڑے گا۔ اگر کوئی تمہارے لیے روٹی نہ پکائے تو تمہیں خود ہی پکانا پڑے گی۔ تم ماشاءاللہ خود صاحبِ علم ہو۔ مجھ سے زیادہ اس بات کو سمجھ سکتے ہو کہ جو تحریک جتنی قوت سے ایک مرتبہ ہوئی ویسی ہی تحریک کے لیے

اتنی ہی قوت ہمیشہ لازمی ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو پھر علم میکانات میں کوئی مقیاس نہ مقرر ہوسکتا اور نہ اس علم کا انضباط ہوسکتا۔ نظام شمسی اور سیارات سے لے کر ایک قطرۂ آب بلکہ ہر ذرّہ اس میکانی قانون کے تابع ہے۔ وَذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ۔

روٹی بغیر محنت کے نہیں مل سکتی۔ میری مراد جسمانی اور طبعی محنت سے ہے۔ وہ شغل بیکاری جسے لوگ دماغی محنت کہتے ہیں، میرے نزدیک اس مقصد کے لیے مفید نہیں۔ ہاں کلوں کی ایجاد سے انسان کو یہ فائدہ ہوا کہ مشقت بدنی میں کفایت اور بچت ہوگئی مگر تحریک اور محرک کی قوتوں میں جو مساوات تھی وہ بعینہٖ باقی ہے۔ جو کام جس قوت سے ہوتا تھا وہ اب بھی اسی قوت سے ہوتا ہے۔ کلوں کی ایجاد نے کام کی مقدار کو بڑھا دیا۔ مگر اس سبب سے کام کی ضرورت دنیا میں زیادہ ہوگئی اور یہی وجہ ہے کہ انسان کو پھر بھی فرصت نہ ملی۔ جتنے کام کی ضرورت بڑھی کلوں نے اتنی ہی محنت کا بچاؤ کر دیا۔ اگر معادلت کے دونوں طرف سے یہ دونوں برابر چیزیں نکال لی جائیں تو پھر بھی انسان کی ذاتی حاجت ایک طرف اور اس کی ذاتی مشقت دوسری طرف باقی رہ جائے گی۔ یہ ایک ایسی ضروری معادلت ہے جو تا قیام قیامت (بلکہ اس کے بعد بھی) باقی رہے گی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کلوں کی ایجاد کے بعد کارخانوں میں کاریگر نظر آتے نہ کھیتوں میں کشت کار۔

مثلاً روٹی کی ضرورت جو سب ضرورتوں سے زیادہ ہے۔ اسی کا حال دیکھو۔ تمام عالم کی زمین مزروعہ۔ ایک رقبۂ آراضی محدود ہے۔ انسانوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ کلوں کی ایجاد نے جتنا محنت کا بچاؤ کر کے پیداوار کو بڑھایا اتنے ہی کھانے والے بڑھ گئے۔ کھانے والوں کے بڑھنے سے مانگ زیادہ ہوگئی قیمت بڑھ گئی۔ قیمت کا بڑھ جانا بعینہٖ محنت کا بڑھ جانا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مانگ کے بڑھنے سے رسد اور بڑھ جاتا ہے اور اس سے قیمت گھٹ جاتی ہے۔ یہ نسبت ہمیشہ دو

خاص ضدوں کے مابین گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔

ایک لطیفہ تمہیں سناتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست تھے۔ پادری صاحب تازہ ولایت۔ ایک دن میں اُن کی ملاقات کو گیا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ خس کی ٹٹیاں لگی تھیں۔ پنکھا قلی پنکھا کھینچ رہا تھا۔ اتفاقاً پنکھا قلی کسی ضرورت سے پنکھا چھوڑ کے چلا گیا۔ سخت گرمی ہو گئی۔ اس پر کچھ ذکر چلا۔ پادری صاحب نے فرمایا۔ واقعی بڑا سخت کام ہے۔ دن بھر ہاتھ نہیں رکتا۔ اگر اب کی میں ولایت گیا تو اس مقصد کے لیے ایک کل بنوا لاؤں گا۔ صاحب نے ایسا ہی کیا۔ پنکھا کھینچنے کی کل ایجاد کی۔ ولایت سے بنوا کے لائے۔ مگر اس سے کیا ہوا۔ محنت کا خرچ تقریباً وہی رہا۔ اس لیے کئی سو روپیہ صرف کر کے کل تیار ہوئی۔ پھر ہندوستان میں آنے جانے کا خرچہ۔ اس حساب سے اگر دیکھا جائے تو وہی ماہواری پڑ جائے گی۔ پنکھا قلی بھی بیکار نہ رہا ہو گا۔ حاجتوں نے اس کو اور کام میں لگا دیا ہو گا۔

خلاصۂ تقریر یہ ہے کہ کلوں کے ایجاد ہونے نے آدمی کو بیکار نہیں کر دیا۔

میری رائے میں بدنی محنت کرنا ہر شخص پر واجب ہے اور واجب بھی کیسا یعنی نہ کفائی۔ اس لیے ایک مثال لکھتا ہوں جس سے میں خیال کرتا ہوں کہ میرا مطلب تم بخوبی سمجھ جاؤ گے۔ تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لو کہ تم اپنے فارم پر ہو اور برسات کا زمانہ قریب ہے۔ مکّا چمار نے اپنا چھپّر باندھا ہے۔ اب وہ اٹھا کے کچی دیواروں پر رکھنا چاہتا ہے۔ لوگ چھپّر اٹھانے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ صرف ایک آدمی کی کمی ہے۔ تم موجود ہو۔ کیا ایسی حالت میں اپنی بی۔ ایس۔ سی۔ کی ڈگری کا تفاخر اپنے دماغ میں لیے ہوئے اسٹڈی روم (کتاب دیکھنے کا کمرہ) میں بیٹھے رہو گے اور اس غریب کے چھپّر اٹھانے

کی تکلیف اپنی شان کے خلاف سمجھو گے، مجھے تمہارے اخلاق سے کبھی امید نہیں ہو سکتی۔ اسی مثال سے سمجھ لو نوعی ضرورتوں کا بار اٹھانے کے لیے قوت اجتماعی کی ضرورت ہے اور میں کہتا ہوں کہ اس کے لیے ہر شخص کو حصہ رسدی طبیعی مشقت کرنا فرض ہے۔ ہر شخص کو کم از کم اتنا کام ضرور کرنا چاہیے جو اس کی ذاتی حاجتوں کی مساوات کو پورا کر دے اور اپنی ذاتِ خاص کے لیے اس کو دوسروں کا بار نہ اٹھانا پڑے۔

ہمارے ملک کے دیہات کا دستور ہے کہ فصل کی تیاری کے وقت کچھ لوگوں کے حقوق فی بیگھ یا فی کھیت دیے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک حصہ فقیر کا بھی ہوتا ہے۔ جو لوگ بلا محنت دنیا کی کھیتی سے فائدہ اٹھاتے ہیں ان کا حال مثل ان دیہاتی فقیروں کے ہے۔

میں اس حق کو کوئی حق نہیں سمجھتا۔ بلکہ یہ ایک قسم کا صدقہ ہے جو اذ لوگ اپنی عنایت سے بیکاروں کو دے دیتے ہیں۔ ہمارے گاؤں کے قریب کفایت علی شاہ ایسے ہی فقیروں میں سے ہے جس کو ہر فصل پر اناج دیا جاتا ہے۔ اس کا دینا ہمیشہ کھلتا ہے۔ مگر ایک دن میں خود اس کے تکیہ کی طرف نکل گیا۔ اس دن سے میرا وہ خیال بدل گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی ذات سے آئند و رد وند کو بڑا فائدہ پہنچتا ہے خصوصاً بوجھیلوں کو۔ گنوار بھاری بھاری بوجھ اٹھائے ہوئے پسینہ ٹپکتے ہوئے دھوپ میں جلتے وہاں آکر سایہ دار درختوں کے نیچے دم لے کر ٹھنڈی ہوا کھاتے ہیں۔ اس کنویں سے جو اس کا ذاتی بنوایا ہوا ہے، پانی پیتے ہیں۔ مسلمان اسی کے گھڑوں سے اور ہندو خود بھر لیا کرتے ہیں۔ بٹھیک میں آگ تیار رہتی ہے۔ لوگ چلمیں بھر بھر کر پیتے ہیں۔ غرضکہ اصول کفایتِ عامہ نے کفایت علی شاہ کو بھی بیکار نہیں چھوڑا۔

شہروں میں بہت سے نکمے عالم، فاضل، مولوی، پادری، پنڈت، اتنا فائدہ بھی خلق اللہ کو نہیں پہنچاتے۔ نظامِ معاشرت سے اگر ان کو کچھ وصول ہوتا ہے تو وہ ہرگز ان کا حق نہیں ہے۔ تم کہو گے کہ اخلاقی فائدہ ان سے پہونچتا ہے۔

ہاں یہ سچ ہے۔ مگر اتنا ہی اخلاقی نقصان بھی پہنچتا ہے۔ اس لیے کہ لوگ ان کی عزت اور شان و شوکت دیکھ کر دھوکا کھا جاتے ہیں اور اسی قسم کے طریقۂ زندگی کو پسند کر کے اسی مقصد سے تحصیلِ علم کرتے ہیں۔ اور ویسے ہی اخلاق اخذ کر کے ان کے خلیفہ اور سجادہ نشین بن جاتے ہیں۔ ان کی اولاد اکثر حالتوں میں اپنے آبائی علم و فضل میں جس کی مقدار بہت ہی کم ہے حد سے زیادہ فخر کرتے ہیں۔ اور لوگ اس خیال سے کہ ان کو تحصیلِ علم و فضل کا موروثی ملکہ حاصل تھا اور اس کے اکتساب کا ذریعہ بھی ان کے پاس موجود تھا۔ ضرور ہے کہ یہ لوگ بہ نسبت اور لوگوں کے زیادہ تر عالم و فاضل ہوں، ان کی قدر کرتے ہیں اور ان کو بلا محنت جو یہ عزت حاصل ہو جاتی ہے اسی وضع کو ان کی اولاد اختیار کر لیتی ہے۔ رفتہ رفتہ علم و فضل خاندان سے مفقود ہو جاتا ہے۔ اور صرف تفاخر باقی رہ جاتا ہے۔

نئی روشنی والوں میں یہی حال ان لوگوں کا ہے جو ریفارمر بن بیٹھے ہیں۔ خود را فضیحت و دیگراں را نصیحت۔ اور اکثر حالتوں میں اسی کو ذریعہ معاش قرار دے لیتے ہیں۔

میں نے سنا ہے کہ تم لا کلاس اٹنڈ کرتے ہو (پڑھتے ہو) میں کسی قسم کے تحصیلِ علم کو منع نہیں کرتا بلکہ علمِ قانون کا حاصل کرنا بہت ضروری

ہے۔ جس سلطنت کے ہم تابع ہیں، اُس کے قانون جاننا ہم پر فرض ہے۔ مگر اتنی نصیحت اگر بوڑھے باپ کی مانو گے تو تمہارے لیے بہت مفید ہوگا۔

میری رائے میں ان پیشہ وروں کو روحانی مسرت کبھی حاصل نہیں ہوتی۔ اس لیے دُنیا کے جھگڑوں سے ایک دم فرصت نہیں ملتی۔ اگرچہ اصل پیشہ وکالت بُرا نہیں۔ مگر بڑی احتیاط کا کام ہے۔ ہمارے شہر میں چند وکیلوں نے جو احتیاط اس باب میں کی ہے وہ ان کا حصّہ ہو گیا۔ شاید تم سے نہ نبھ سکے گی۔ غاصب و ظالم کی حمایت کرنا ہر مذہب میں ناجائز ہے اور مجھے خوف ہے کہ اس پیشے میں اس کا خیال کمتر رہتا ہے۔

انجینیری اور اس سے بہتر ڈاکٹری ہے۔ اگر یہ تم سے ہو سکے تو کرو ورنہ میرے پاس چلے آؤ اور میرے ساتھ ہل جوتو۔ یہ بہت ہی عمدہ کام ہے۔ بڑے لطف سے زندگی کٹتی ہے۔ اطمینان، فراغت، صحت، سب کچھ اسی کام میں ہے۔ (کنٹری لائف) دیہات کی زندگی بسر کرنے کا مزا اہلِ شہر کیا جانیں۔ میں خدا کا شکر کرتا ہوں کہ مجھے اسی دنیا میں خدا نے بہشت عطا فرمائی ہے۔ اگر تمہیں خدا توفیق دے تو تم بھی یہی لائف اختیار کرو۔ نوکری کے خیال میں نہ پڑو۔ بڑی بڑی ذمہ داریاں اپنے سر پر لینا آسان ہے۔ مگر اس کا نباہ مشکل ہو جاتا ہے۔ میرے جیتے جی تم ان جھگڑوں میں نہ پڑو۔ آؤ چند روز کی زندگی کسی نیک کام میں صرف کریں۔

یاد رکھو کہ ایک نہ ایک دن ایسا آنے والا ہے جب علوم ملکی زبان میں سکھائے جائیں گے۔ اگرچہ فی زمانہ بعض عقلاء نے اس امر سے اختلاف کیا تھا کہ ہماری زبان یعنی اردو علمی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا تعلیم

علومِ انگریزی زبان میں ہونا چاہیے۔ یہ اختلاف محض موجودہ ضرورتوں کے اعتبار سے تھا یا اس مایوسی کی وجہ سے جو اردو کی کم مائگی پر نظر کر کے پیدا ہو سکتی ہے۔ میرے خیال میں یہ کوشش کیے بغیر مایوس ہو جانا ٹھیک نہیں۔ ع

این فتوئ ہمت بود ارباب ہمم را

میں نے تمہاری بے اجازت تمہاری ڈکشنری کو جلد سے نکال کر اس کے اجزاء علیحدہ کر دیے اور انٹر لیو کر کے دو دو سو صفحوں کا ایک جزو جدا کر لیا ہے جس قدر الفاظ اور اصطلاحات علمی الفاظ انگریزی کے مقابلے میں مجھ کو یاد ہیں ان کو لکھتا جاتا ہوں۔

دبسٹر ڈکشنری کے صفحات کا شمار ۱۶۸۱ ہے۔ اگر بحساب اوسط ایک صفحہ روز لکھا جائے (جو کم از کم ہے) اور ایک گھنٹہ اس کام میں صرف ہو (جو زیادہ سے زیادہ ہے) تو چار برس سات مہینے گیارہ دن میں کل ڈکشنری ہنستے کھیلتے مترجمہ ہو جائے گی۔ ایک گھنٹہ روزانہ اس کارِ اہم کے لیے صرف کرنا کچھ ایسا بار نہیں ہے اور اگر اس کا شوق تم کو بھی ویسا ہی ہو جیسا کہ مجھے ہے اور پانچ گھنٹہ روز ہم تم مل کے محنت کر سکیں تو کل کام ۳۳۶ روز میں یعنی گیارہ مہینے میں تمام ہو سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بعض الفاظ انگریزی کے مقابل مشکل سے لفظ ملیں گے۔ مگر یہ تم جانتے ہو کہ مجھے لفظوں کے گڑھنے میں ایک خاص ملکہ ہے۔ جب تم میرے ساتھ کام کرو گے تو عجب نہیں کہ چند روز میں یہ صفت تم میں بھی پیدا ہو جائے۔ شاید تم کہو کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ اس کی دلیل مجھ سے سنو۔

اگر تم غور کروگے تو تم پر واضح ہو جائے گا کہ دنیا میں جس طرح حد سے زیادہ حسین آدمی کم ہوتے ہیں۔ اسی طرح حد سے زیادہ بدصورت بھی کم ہوتے ہیں۔ یہ جو ایک مشہور مثل عورتوں کی زبان زد ہے یو وہ عورتوں کے حسنِ ظاہری کی نسبت کہا کرتی ہیں "مثلاً فلاں لڑکی آدمی کا بچہ ہے" یعنی نہ غیر معمولی حیثیت سے حسین ہے نہ بدصورت۔ ذہن اور مادّہ کی معاونت کا مسئلہ بالکل منقح ہو چکا ہے۔ شاید علمِ نفس کے پڑھنے کے بعد تم کو اس مسئلہ میں کوئی شک نہ رہا ہوگا۔ تو اسی کلیّہ کو تم ذہنیات میں بھی منطبق کر سکتے ہو۔

حاصل کلام کا یہ ہے کہ جس طرح وہ لوگ کمیاب ہیں جو حد سے زیادہ عقیل ہیں اسی طرح وہ لوگ بھی شاذ و نادر ہیں جو حد سے زیادہ بیوقوف ہوں۔ ایڈئیٹ کے دماغ کی بناوٹ ہی سے اس کا ایڈئیٹ ہونا ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس سے چند اور قضایا کو واسطہ گردان کر یہ امر بخوبی ثابت ہو سکتا ہے کہ فطرت نے ہر اوسط درجے کے انسان کو اوسط درجے کی قابلیتیں عطا کی ہیں۔ مثلاً لوگ کہتے ہیں کہ موزوں طبعی خداداد ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں، لیکن میں کہتا ہوں کہ اس خداداد قابلیت میں کل انسان شریک ہیں۔ کسی میں کم اور کسی میں زیادہ۔ اس کے امکان سے مجھے انکار نہیں کہ ایک بہت ہی قلیل تعداد از روئے خلقت غیر موزوں طبع ہو۔

یقین ہے کہ تم میری تقریر کا منشاء سمجھ گئے ہوگے۔ یہ مسئلہ بہت اہم اور قابل غور ہے۔ اس لیے میں اس پر زیادہ تر توجہ چاہتا ہوں، اور یہ بھی بتائے دیتا ہوں کہ اس مسئلہ کو میں کیوں اہم کہتا ہوں۔

اس مسئلہ میں بہت بڑی غلط فہمی واقع ہوئی ہے۔ نہ صرف عوام بلکہ خواص میں بھی عام خیال یہ ہے کہ عدم قابلیت کی طرف تعداد زیادہ ہے اور وجود قابلیت کی طرف کم۔ مگر استدلال سے اس کے برعکس ثابت ہوتا ہے۔ وجود قابلیت کی طرف شمار بہت زیادہ ہے۔ بہ نسبت عدم قابلیت کے۔

عجب تر یہ ہے کہ جزئی مثال یہ ہے کہ میرے نزدیک تقریباً تمام انسان موزوں طبع ہیں اور بہت ہی کم غیر موزوں طبع۔ اور خلق الٰہی سے یہ امر مستبعد معلوم ہوتا ہے کہ اس کی عنایت خاص ہو عام نہ ہو۔

عجب تر یہ ہے کہ نہ صرف افراد انسان کو بلکہ خاص مقامات کو بھی اکثر لوگ ایک خاص صفت کے ساتھ مخصوص کر دیتے ہیں۔ مثلاً اس قسم کے جملے تم نے اکثر سنے۔ فلاں مقام کے لوگ قدرتی موزوں طبع ہیں۔ فلاں خطہ مردم خیز ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس امر کے اصلی سبب پر جب تم غور کروگے تو اس کو میری رائے کے موید پاؤگے۔

مثلاً کہا جاتا ہے کہ لکھنؤ کے رہنے والے موزوں طبع ہوتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ صرف مسلمان یا ہندو۔ یا ہندو مسلمانوں میں سے صرف اعلیٰ طبقہ کے لوگ یا ادنیٰ کے بھی اور پھر یہ پوچھنا ہے کہ مضافات لکھنؤ میں جو دیہات ہیں وہاں کے لوگ بھی یا صرف حدود میونسپلٹی کے اندر جو لوگ رہتے ہیں، تفصیلاتِ مذکورہ پر نظر کرنے سے تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ اصلی سبب سوسائٹی ہے نہ طبیعت۔ لکھنؤ کی سوسائٹی میں اس قابلیت کو ظاہر کرنے کے اسباب پیدا ہو گئے۔ اس لیے وہاں ہزارہا موزوں طبع نکل آئے۔ جس جگہ اس قسم کے اسباب فراہم ہو جائیں گے۔ وہاں ہزاروں موزوں طبع

نکل آئیں گے ۔

جن لوگوں نے صرف منطق قیاسی پڑھی ہے وہ اس استدلال کو شاید اقناعی کہیں۔ لیکن تم ماشاءاللہ منطق استقرائی کے درس میں شریک ہو چکے ہو اور علوم تجربی کے پڑھنے سے تم کو مواد استدلال کے فراہم کرنے اور ترتیب دینے کا سلیقہ حاصل ہو گیا ہے۔ لہٰذا تمہارے لیے یہ استدلال قطعی ہے۔ اب اس مسئلہ کی اہمیت کا باعث سنو۔

اکثر ہونہار طالب علم اس غلط فہمی میں پڑ کر اکتساب اور تکمیل سے باز رہتے ہیں۔ یہ قاعدہ ہے کہ ہر علم وفن کی ابتدائی تحصیل میں اکثر دقتیں واقع ہوا کرتی ہیں۔ اس کا سبب نقص طریقۂ تعلیم ہے۔ اس لیے اکثر تعلیم بسائط اور مفردات سے شروع ہوتی ہے اور تم کو کیمسٹری کے پڑھنے سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ بسائط بعد تحریر اور تحلیل کے حاصل ہوتے ہیں۔ چاہیے تھا کہ تعلیم میں تحریر اور تحلیل کے عمل سے ابتداء کرتے تو کوئی مشکل نہ پڑتی۔ ابتداء کی گئی ہے بسائط سے اور ان سے ترکیب دے کر مرکبات پیدا کیے جاتے ہیں۔ بسائط کی اجنبیت اوپر کے بیان سے واضح ہے۔ ان کے افہام و تفہیم میں دقت کا واقع ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ مجھے یہ مشکل تمہارے چھوٹے بھائی صادق کو جیومطریہ پڑھانے سے معلوم ہوئی۔ نقطہ، خط، سطح، جسم کے حدود ایک ہفتہ تک سمجھایا کیا، مگر اس کی سمجھ میں نہ آئے۔ آخر میں نے طریقۂ تعلیم کو بدل کر جسم طبعی سے ابتداء کی۔ فوراً سمجھ گیا اور بہت ہی کم مدت میں اشکال ہندسہ سمجھنے لگا۔

اس قسم کی دقتوں کے واقع ہونے سے اکثر طلباء بے دل ہو کر یہ سمجھ لیا کرتے ہیں اور عام خیال اسی خیال کو پختہ کر دیتا ہے کہ مجھ میں اس کے سمجھنے کی خداداد قابلیت نہیں۔ کوشش بے سود ہے۔ یہ مشکلیں میرے لیے سلف اسٹڈی

کی برکتوں نے حل کردیں۔ اب مشکل سے مشکل مسائل کو میں آسان سمجھنے لگا ہوں۔

یہ خط بہت طولانی ہوگیا اور ایک مزے کی بات لکھنا ابھی باقی ہے۔ وہ یہ کہ میرے دوست اور تمہارے بزرگ مرزا رسوا صاحب نے میری سوانح عمری لکھ کر تمام کرلی۔ اب ان کا خیال ہے کہ اس کے ساتھ ہی میرے خطوط جو تمہارے نام اور دوستوں کو وقتاً فوقتاً لکھے گئے ہیں جمع کیے جائیں۔ لہٰذا بعد ملاحظہ خط ہٰذا کے جس قدر خط تمہارے پاس پڑے پڑائے ہوں، بھیج دو اور یہ خط بھی واپس کر دینا تاکہ سوانح عمری کے ساتھ شائع کر دیا جائے۔

مرزا رسوا کے طرزِ تحریر سے تم واقف ہو۔ انھوں نے میری زندگی کے عام واقعات کو جو ہر شخص پر حسب اقتضائے وقت اور ضروریات کے واقع ہوا کرتے ہیں، ایک ناول بنا دیا ہے۔ مگر اتنی عنایت کی ہے کہ اشعار نہیں ٹھونسے جس کا میں ممنون ہوں۔ والدّعا

راقم۔ عابدؔ

مرزا صاحب۔ السلام علیٰ من اتبع الہدیٰ۔ ایک امر دینی نے مجھ کو اس خط کے لکھنے پر مجبور کیا۔ وہ یہ ہے کہ میں نے سنا ہے کہ آپ مفلسی کو گناہ سمجھتے ہیں۔ حیف کی بات ہے کہ انسان تقدیر سے مفلس ہو جائے تو اس میں اس کا کیا قصور ہے۔ مگر ہاں سچ ہے آپ تقدیر کے قایل نہ ہوں گے کیونکہ نیچریوں کا مسلک یہی ہے تقصیر معاف ہو۔ ایک زمانے میں آپ خود نادار تھے۔ بلدیو مستری کے لڑکے کے پڑھانے پر نوکری کرنے کا زمانہ شاید اس جاہ و ثروت کے عہد میں آپ بھول گئے۔ جناب ہر حالت میں خدا سے ڈرنا بہت ضروری امر ہے۔ تعیشِ چند روزہ میں پڑ کر خدا کو بھول جانا کفرانِ نعمت کہلاتا ہے اور اس شخص کو

جو کفرانِ نعمت کرے کافر کہتے ہیں۔ آپ انگریزی سرکار سے توسّل رکھتے ہیں۔ اس لیے میں آپ سے ڈرتا ہوں۔ فلہٰذا میں نے اپنا نام خط میں نہیں لکھا۔ ابتدائی زمانے میں آپ کے عقائد بہت درست تھے اور آپ روزہ و نماز کے پابند تھے۔ اب سنا گیا ہے کہ آپ بالکل نیچری ہو گئے اور روزہ و نماز سب کو آپ نے سلام کیا۔ ایک اور امر جس کے مجھے سخت افسوس ہوا۔ وہ یہ کہ آپ فقرار و مساکین کی اعانت کو بُرا سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ فقراء کو پیسہ یا چٹکی آٹا دینا آپ کے نزدیک گناہِ عظیم ہے اور جو لوگ مسجد بنانے یا حج بیت اللہ یا زیارت کے نام سے کچھ مانگنے آتے ہیں۔ اُن پر آپ دروازہ سخاوت کا بند کر دیتے ہیں اور کفر اور بے دینی کے کاموں میں آپ نے ہزار ہار وپیہ بطور چندے کے دیا۔ چنانچہ ایک نیچری کو آپ نے ولایت کے سفر کے لیے پانچ سو روپیہ بطور توشے کے دیے۔ جو کتابیں کفر و ضلالت کی آپ لکھ رہے ہیں ان کے چھاپنے اور شائع کرنے میں ہزاروں روپے کے صرف کا بار اپنے ذمّے لے لیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ قارون پر ایک زکوٰۃ کے نہ دینے سے کیا عذاب نازل ہوا کہ وہ زمین میں دھنس گیا اور تا قیامِ قیامت دھنستا چلا جائے گا اور یہ خزانہ اُس کے سر پر بار رہے۔

جز ایں نیست کہ دولت کی زیادتی سے آپ میں غرور سما گیا۔ غرور کی برائیاں من جمیع الوجوہ ثابت ہیں۔ کیا آپ کو شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کا یہ شعر یاد نہیں رہا ؎

تکبّر عزازیل را خوار کرد — بزندانِ لعنت گرفتار کرد

الرّاقم عبداللہ

مرزا عابد حسین نے اس گمنام خط کا جواب جو مع اس خط کے اخبار میں چھپوا دیا تھا۔ جواب کی نقل یہ ہے :-

جناب عبداللہ صاحب کا خط میں نے پڑھا۔ ان کی حمیتِ دینی سے میرا دل بہت خوش ہوتا اگر وہ خلوص کے ساتھ ہوتی اور جو کلماتِ غیظ و غضب ان کے قلم سے میری شان میں نکلے اس کو میں مقتضائے جوشِ دینی سمجھتا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ قبل اس کے کہ اُن الزامات کا جواب دوں جو کاتب نے میری نسبت عائد کیے ہیں، میں اُسے ایک نیک نصیحت کرتا ہوں۔ جس پر مجھے امید ہے کہ وہ آئندہ ضرور عمل کرے گا۔ بندۂ خدا کے نام سے خطوط لکھنا خصوصاً اس حالت میں جب کہ عبارت خط کی متضمّن ہو کسی جرم قانونی پر ایک امرِ خطرناک ہے۔ کیوں کہ خفیہ پولیس کو جو تنخواہ سرکار سے ملتی ہے وہ فضول نہیں ہوتی۔ اگرچہ میں نے خفیہ پولیس سے اعانت نہیں لی۔ لیکن کاتب کو ماخوذ کر کے سزا دلا سکتا ہوں۔ کاتب کو اس امر کے یقین دلانے کے لیے کہ میں اپنے اس دعوے میں صادق ہوں اس کو ایسا پتہ بتا دیتا ہوں جس سے وہ سمجھ جائے گا کہ میں اس کو خوب جانتا ہوں۔ حسین آباد۔ مشک گنج۔ فیض آباد۔ میں اس کو جانتا ہوں یا نہیں۔ اب رہا یہ امر کہ وہ مجرم ہے یا نہیں۔ اس پر اس کا گنہگار دل خود شہادت دے گا۔ لیکن بفحوائے انّما ینتقم الضّعیف۔ اس سے انتقام لینا کسرِ شان سمجھتا ہوں۔

اس کی بے تہذیبی پر مجھے افسوس ہوا اور اس کی وجہ وہی مفلسی ہے جس کو میں گناہ سمجھتا ہوں۔ اب الزامات کا جواب دیتا ہوں۔

میں مفلسی کو گناہ نہیں کہتا۔ مگر خود اختیاری مفلسی کو گناہ سمجھتا ہوں۔ خود اختیاری مفلسی کا سبب اسراف ہے اور اسی لفظ کے مفہوم کو

وسعت دینے سے اور اسباب ل جاتے ہیں جن کے جدا جدا نام ہیں۔ مثلاً دوسرے لفظوں میں اس اسراف کو ہم خرچ کی زیادتی اور دخل کی کمی بھی کہہ سکتے ہیں اور اس کے اسباب کاہلی اور تن آسانی ہیں۔ العاقل تکفیہ الاشارہ۔

عقائد کے باب میں اس کو کچھ لکھنا میں فرض نہیں سمجھتا۔ اقرار شہادتین کے بعد کسی کو یہ حق نہیں حاصل ہو سکتا کہ شخص مقر کے اسلام سے انکار کرے اور جو اس پر بھی منکر ہو اس منکر پر کسی امر کے ثبوت کے لیے معجزہ بھی کافی نہیں ہے۔ بحمداللہ کہ میرے اوضاع و اخلاق نے مجھ کو ثقات کی نظروں میں وہ عزت دے رکھی ہے جسے کسی شخص منکر کا جھوٹی قسم کھانا بھی مشکوک نہیں کر سکتا۔

بے شک میں نے ایک متکلم، فقیہہ، ثقہ، نوجوان فاضل کو جس نے انگریزی اور فرنچ اس غرض سے حاصل کی تھی کہ مغربی ملکوں میں جا کر اسلامی اور ایمانی وعظ کہوں اور وہاں کے لوگوں کو دعوتِ اسلام دوں یا کم از کم ان لوگوں کے دلوں میں اسلام اور اہلِ اسلام کی محبت پیدا کرنے کی کوشش کروں، بطور ہدیہ مختصر پانچ سو روپیہ اپنا مذہبی فرض سمجھ کر نذر کیے تھے۔ ایسے شخص کو جس نے اپنی تمام امیدوں کو خاک میں ملا کر تمام زندگی کارِ خیر کے لیے وقف کر دی۔ کاتب نیچری اور بد مذہب کہتا ہے اور جو کتابیں میں لکھ کر شائع کرتا ہوں۔ حاشا کہ ان میں کفر و ضلالت ہو بلکہ وہ مغربی علوم کی کتابیں جن کی اس وقت نہایت ضرورت ہے اور ہزاروں بلکہ لاکھوں بندگانِ خدا کی بھلائی اس میں متصور ہے۔ قوم اور ملک کی مفلسی اس کے عدم علم پر منحصر ہے۔ میں خدا کا شکر کرتا

ہوں کہ مجھے خدا نے اس کے ترجمہ کرنے اور شائع کرنے کی توفیق مرحمت کی۔ مسجد بنوانے یا حج وزیارت کے نام سے بھیک مانگنے والوں کو میں اچھی طرح پہچان لیتا ہوں اور علیٰ ہذالقیاس ان لوگوں کو بھی جو ملک میں تعصب پھیلانے یا صرف اپنا شکم پُر کرنے کے لیے لوگوں کو فریب دیکر چندے جمع کیا کرتے ہیں۔

بلدیو کے لڑکے کو پڑھانے کا طعن کاتب کی سخافتِ عقل پر دلیل ہے۔ کسی قسم کی نوکری اور مزدوری عیب نہیں۔ بعض علمائے ملت نے جنگلوں سے لکڑیاں کاٹ کر بازار میں فروخت کرنے کو حقیر نہ سمجھا۔ خود بابِ مدینۃ العلم حضرت علی مرتضیٰ یہودیوں کے کھیتوں میں پانی دینے کو ذلیل نہ تصور فرماتے تھے۔ افسوس کاتب پیشوایانِ دین کے اخلاق اور اقوال سے بالکل چشم پوشی کرتا ہے۔

میں فخر کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں مادھو (پسر بلدیو) کے پڑھانے پر پانچ روپیہ کا نوکر تھا۔ اور میں نے ہلاس لُہار سے لہاری کا کام سیکھا اور ان کاموں سے برسوں اپنے اور اپنے اہل وعیال کے لیے مایحتاج مہیا کیا۔ مگر کبھی میں نے اپنے کارِ منصبی کے کرنے میں سُستی اور کاہلی نہیں کی۔ مادھو نے میری تعلیم سے بہت فائدہ اٹھایا۔ وہ اس وقت اعلیٰ درجہ کا میکانک ہے اور اس کو ریلوے میں پانچ سو روپیہ ماہوار کی نوکری ملتی تھی مگر اس نے نہ کی۔ میرے کارخانۂ حدادی میں جس کو میں نے صرف کلوں کے نمونے بنا کر ملک میں شائع کرنے کے لیئے قائم کیا ہے۔ خوشی سے مہتمم ہے اور اس کارِ خیر میں میرا شریک ہے۔ میں اسے مثل اپنے فرزند کے سمجھتا ہوں۔ اور وہ مجھ کو اسی طرح اپنا بزرگ

اور مربی خیال کرتا ہے مجھے فخر ہے کہ خدا کے فضل سے میری تعلیم بے کار نہیں ہوئی۔

الراقم
عابد لہسار

غریب پرور سلامت

حقیر عرض می رساند

فدوی قوم شریف سے ہے۔ فدوی کے والد سرکار انگریزی میں ڈپٹی کلکٹر تھے اور فدوی کے نانا عہدِ شاہی میں رسالہ دار تھے اور فدوی کی نانی نواب ثروت محل کی مُنہ بولی بہن تھیں مگر بالفعل بہ سبب گردشِ فلک کج رفتار کے نان شبینہ کو محتاج ہے۔ آپ کی دریا دلی اور سخاوت کا شہرہ دور سے سن کے آیا ہے۔ امید ہے کہ ایک لقمہ نان کو ہیچ کرتا عمر دعائے دولت میں مصروف رہے۔ ع

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را

الٰہی آفتابِ دولتِ اقبال تا ابد الآباد تاباں و درخشاں باد

عرضے

فدوی
سرفراز حسین بقلم خود

عبارتِ ظہری عرضی ہذا

جلیل الشان رفیع المکان مرزا عابد حسین صاحب دام اقبالکم!
بعد اہدائے ہدیۂ سلام کہ بہترین تحفۂ اسلام است و استخبار مزاج وہاج ریاست اسراج باعثِ تحریر ہذا یہ ہے کہ جناب میر سرفراز حسین صاحب کی شرافت خاندانی و نیز لیاقت ذاتی سے کماحقہٗ واقف ہوں۔ اگر آنجناب کی مساعئ جمیلہ سے کوئی عہدہ معقول ان کو سرکار انگریزی میں مل جائیگا تو یہ مخلص قدیم نہایت ہی ممنون ہوگا۔

الدّاعی الی الخیر۔ ابو الخیر۔ ابو الخیرات
سیّد مکمل الدین الملقب بہ تکملۃ العلماء

جناب مولانا صاحب۔ تسلیم!
افسوس ہے کہ سرکار انگریزی سے کوئی مدِ خیرات میرے حوالے نہیں ہے اور اگر ہوتی بھی تو اس میں سے میں سائل کو ایک حبہ نہ دیتا۔ اس لیے کہ ایسا شخص جو محنت کرنے کی قوت رکھتا ہو اور شرافتِ خاندانی جتا کر بھیک مانگے اس کی اعانت کرنا قوم کو بھک منگا بنانا ہے۔ سائل شاید کچھ خواندہ ہے۔ اگر وہ محنت کرنے پر آمادہ ہو جائے تو میں اس کو دس مزدوروں کی جماعت واری پانچ آنہ روزانہ دے سکتا ہوں۔ اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں کر سکتا۔ معاف فرمائیے۔ سائل نے اپنی عرضی میں کلمات گستاخی میری نسبت میں لکھے ہیں۔ مثلاً شاہاں چہ عجب الخ اس کو

میں اس کی کم علمی پر محمول کرتا ہوں مگر حیران ہوں کہ جناب کے مبالغاتِ صریح اور مکابراتِ بیّن کو کس حد میں شمار کروں۔

خادم العلماء
عابد

عالی جناب معلّی الالقاب قدر دانِ ہر علم و ہُنر فیض گستر مرزا عابد حسین صاحب دام الطافہٗ۔ بعد تسلیم بصد تکریم معروض آنکہ مدّت مدید و عرصۂ بعید منقضی ہوا کہ آپ کی خیر و عافیت سے اس مخلص قدیم کو اطلاع نہیں ہوئی۔ واقعی آپ اپنے دوستانِ قدیم کو بالکل ہی بھول گئے؎

تم ہمیں بھول گئے ہو صاحب
ہم تمہیں یاد کیا کرتے ہیں

مدّت ہوئی کہ ایک پرچۂ قرطاس سے یاد شاد نہ فرمایا۔ دریں ولا بُلبُلِ بوستانِ فصاحت و قمریٔ سروستانِ بلاغت سعدیٔ دوران و خاقانی آوان نواب احمد حسین خاں سلمہٗ المتخلّص بہ ساحر نے ایک قصیدۂ بہاریہ ذو مطلعین آپ کی مدح میں تحریر کیا ہے۔ اگرچہ آپ کے فضائل و مناقب اور مناصب و مراتب بیرون از دائرہ نظم و بیان ہیں۔ مگر جو امور عیاں ہیں ان میں سے بعض کے ذکر پر بمصداق لایدرک کلّہٗ جو کچھ کہا ہے، خوب کہا ہے۔ امید قوی ہے کہ آپ اس شاعر نوخیز۔ نازک خیال (جو کہ ابھی سے جودت اور ذکاوت اس کی شہرۂ شعرائے ماضی کو شرمائے دیتی ہے۔) کی محنت کی داد اور لیاقت کا صلہ دیں گے۔ اگرچہ ابتدائے عمر میں آپ کو اس فن شریف یعنی شاعری کی طرف چنداں توجہ نہ تھی

مگر اب میں نے سنا ہے کہ آپ نے ہر علم و فن میں مہارتِ تام استعداد مالا کلام حاصل کی ہے۔ پس علمِ شعر میں بھی علیٰ ہذا۔ لہٰذا آپ اس قصیدہ سے بہت خوش ہوں گے۔ یہ دانع رائے عالی ہو کہ تشبیب اس قصیدہ کی بالکل حسب محاورۂ حال نیچرل مذاق کی ہے اور مذاق نیچری آپ کو بالطبع بلکہ بالفطرت پسند ہے۔ یوں تو قصیدہ از سر تا پا مرصع ہے خصوصاً باغ کا سین بہت ہی عمدہ کھنچ گیا ہے۔ گویا پورا فوٹو ہے۔ گھوڑے کی تعریف میں بھی ایک شعر قیامت کا کہا ہے۔ (افسوس ہے کہ اس قصیدہ غرا کی پوری نقل ہم کو دستیاب نہ ہوئی ورنہ ضرور ہی شائع کرتے۔)

جواب

میر صاحب۔ دوستوں کو بھول جانا ایک خُلق مذموم ہے۔ میں اپنے دوستوں کو اگر وہ فی الواقع میرے دوست ہوں۔ بحمداللہ کبھی نہیں بھولتا۔ اپنے شاگرد کی مدح سرائی میں جس قدر شعری مبالغوں کو آپ نے دخل دیا ہے اُس کی داد میں اس حالت میں دے سکتا تھا کہ میں بھی مثل آپ کے شاعر ہوتا۔ اور اس سے زیادہ آپ کے شاگرد رشید کے قصیدہ کی قدر شناسی سے محروم ہوں۔ والحمد للہ علیٰ ذالک۔

آپ کو خود یاد ہوگا کہ اوائل عمر میں آپ کو شعر گوئی پر ملامت کیا کرتا تھا۔ میرا خیال اب تک وہی ہے۔ مجھ کو ہر ایسے کام سے جس میں کوئی دینی و دُنیوی منفعت نہ ہو، نفرت کلی ہے اور ایسے فنِ رذیل سے جس میں کوئی مضرت ہو خصوصاً خلقی مضرت، بدرجۂ اولیٰ نفرت ہونا

چاہیے۔ اگر آپ کو کچھ بھی اگلے دوستوں کا خیال ہے تو صرف اتنی فکر اس مقدمے کے سمجھنے کے لیے کافی ہے جتنی ایک مصرعہ لگانے کے لیے کرنا پڑتی ہے یا اس سے بھی کم کہ میری مدح میں قصیدہ کہنے سے زیادہ کوئی امر لغو و فضول دنیا میں ہو سکتا ہے۔

میرے آپ کے مزاج نہ بچپن میں ہوئی تھی اور نہ اب میں اس کو جائز رکھتا ہوں۔ آپ نے اپنے رقعہ میں مجھ کو کھلم کھلا نیچری بنایا ہے اور نیچری بھی مناسب طبع اور فطرت کے ساتھ۔ اے سبحان اللہ! اور کیا کہوں۔ میں نے آپ کی خاطر سے قصیدہ کی تشبیب اس نظر سے دیکھی کہ وہ باغ کا فوٹو ہے۔ مگر آپ یقین ہی کیجیے کہ اس میں ایک برگ خزانی کا بھی فوٹو نہیں ہے۔ گھوڑے کی تعریف میں جس شعر کی آپ نے بہت تعریف کی ہے وہ سرعتِ رفتار کے باب میں اس سے زیادہ مبالغہ میں (کہ شاعر نہیں ہوں) کر سکتا ہوں۔ مردِ خدا اس جھوٹ کے طومار سے کیا حاصل۔ سرعتِ خیال کہاں گھوڑے کی چال کی یہ بھی کیسی مہمل بات ہے۔ اگر میرا گھوڑا پانچ میل بائیسکل کے ساتھ دوڑ سکے اور میں دوڑا سکوں تو ولایت کی کسی نمایش سے اوّل درجے کے انعام اور تمغہ حاصل کرنے کے لائق ہو جاؤں۔ آپ نے تمام عمر شاعری کی ہے اور میں نے بالقصد ایک مصرعہ کبھی موزوں نہیں کیا۔ لیکن برا نہ مانیے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک آپ شاعری کے مفہوم سے بھی واقف نہیں۔ علم جمال جو فنِ شعر کا ماخذ اور اصل اصول ہے۔ اس کا نام بھی آپ نے نہ سنا ہوگا۔ خیر آپ کی عمر کا بہت بڑا اور قیمتی حصّہ تو اس لغویات میں صرف ہو چکا۔ اب بھی توبہ کیجیے اور چند روزہ حیات کو کسی ایسے کام میں صرف کیجیے جس سے خدا کی خدائی کا یا کچھ

آپ ہی کا بھلا ہو۔ اور اگر بقولئے 'خوئے بد در طبیعتے کہ نشست' آپ اس سے باز نہیں رہ سکتے تو اپنے ساتھ ہونہار ناتجربہ کار لڑکوں کو تو نہ تباہ کیجیے۔ حضرت آپ کا پندرہ روپیہ وظیفہ تھا۔ اس سے نبھ گئی۔ یہ بیچارے اگر اس شغل بے کاری میں پڑے تو مارے فاقوں کے مر جائیں گے۔

اور ہاں خوب یاد آیا۔ تم ہمیں بھول گئے۔ الخ یہ شعر آپ ایسے سن رسیدہ کی طرف سے مجھ بڈھے کی شان میں کس قدر موزوں ہے۔ معاف فرمائیے اور آیندہ ایسے خطوط سے کبھی مجھ کو یادشاد نہ فرمایا کیجیے۔

آپ کا قدیم ملامت گر
عابد

ولایت سے ایک دوست کا خط

جناب مرزا صاحب۔ تسلیم! میں حسب الارشاد آپ کے پیرس کے اس کتب خانہ میں جس کا پتہ آپ نے تحریر کیا ہے خود گیا اور حکیم عمر خیام کا الجبرہ دیکھا۔ واقعی جس مسئلے کے باب میں گفتگو تھی وہ قدیم مسلمانوں کو معلوم تھا۔ آپ کا خیال بالکل دُرست ہے۔ مجھے پیرس میں بہت ہی کم ٹھہرنا تھا۔ اس لیے اس کتاب کی نقل حاصل کرنے کی کوشش نہ کر سکا اور میرے خیال میں شاید ممکن بھی نہ ہو۔ برٹش میوزیم سے شاید ہر کتاب

کی نقل مل سکتی ہے مگر بہ صرفِ کثیر۔ آج کل میرے ذمے بہت کام ہے۔
اس لیے تفصیلی خط نہ لکھ سکا۔ معاف فرمائیے۔ آیندہ تعطیل میں آپ
کی فرمایشات کی تعمیل کرنے کی کوشش کروں گا۔

آپ کا خادم
عبدالحسنین

جناب من۔ آپ بیرسٹری کی دُھن میں ہیں۔ معلوم ہو گیا کہ آپ
سے میرا کام نہ ہوگا۔ آپ کی "شاید" اور "کوشش" نے مجھے بالکل مایوس
کر دیا۔ وہ الفاظ جو افادہ معنی شک اور شرط کا کرتے ہیں۔ ان سے
میری تسلی نہ ہوگی۔

پیرس آپ گئے اور لائبریری بھی پہنچے۔ اس کے لیے آپ کو وقت
مل گیا۔ جس کا میں ممنون ہوا۔ لیکن اگر کیوریٹر سے اتنا اور پوچھ لیتے کہ
نقل مل سکتی ہے اور اگر مل سکتی ہے تو کس طرح ؟ تو کچھ بہت زیادہ وقت
صرف نہ ہو جاتا۔ فرنچ بھی آپ کافی طور سے جانتے ہیں۔ لہٰذا اجنبیتِ
زبان کا بھی عذر نہیں چل سکتا۔ یہ کہیے کہ یاد نہیں رہا اور یاد کیوں نہ رہا؟
اس کا سبب مجھ سے پوچھیے۔ آپ کو تحقیقِ علوم کا ذاتی شوق نہیں ہے۔
معاف کیجیے۔ میں قدرتی صاف گو ہوں۔ لہٰذا بے تمیز واقع ہوں۔

برٹش میوزیم آپ ایک نہ ایک دن جا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ اس دن
پارک جانا ملتوی کیجیے۔ میں یقیناً عرض کرتا ہوں کہ آپ کی صحت کو ایک
دن پارک نہ جانے سے کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا۔ تفصیلی خط لکھیے۔ دو جملے
لکھیے۔ مگر مطلب کے۔ زیادہ شوق۔

آپ کا دوست عابد

شیخ صاحب تسلیم! آپ مجھ کو بر سبیلِ شکایت لکھتے ہیں کہ تیرے ضلع میں جو مذہبی مناظرہ ہوا تو اس میں کیوں نہ گیا؟ کیا یہ ضرور ہے کہ جس قسم کی طبیعت آپ کی ہو ویسی بعینہٖ میری بھی طبیعت ہو۔ میں نے کسی مناظرہ کا یہ نتیجہ نہیں سنا کہ کسی نے ایسی محفلوں کے ذریعہ سے کوئی فیض حاصل کیا ہو۔ نہ کوئی سُنّی شیعہ ہوا۔ نہ کوئی شیعہ سنی۔ نہ کوئی عیسائی مسلمان ہوا۔ نہ بالعکس۔ ہاں ضد اور تعصب کسی قدر ضرور بڑھ جاتا ہے۔ اور ان قوتوں کے بڑھانے کی مجھ کو ضرورت نہیں معلوم ہوتی بلکہ حتی الامکان میں اس کے خلاف کوشش کرتا ہوں اور خدا سے دعا ہے کہ مسلمانوں کی ضد اور تعصب کے مادّے میں کمی واقع ہو۔ علمائے ملّت نے کافی سرمایۂ تحقیق کا مہیّا کر دیا ہے۔ خصوصًا اہلِ اسلام نے تو اس باب میں بہت کچھ سعی کی ہے۔ یہ سرمایۂ تحقیق ایک عمر کے مطالعہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ تُو تُو مَیں مَیں سے کیا فائدہ۔ پہلے کچھ فکرِ معاش کیجیے اور جب یہ حاصل ہو جائے تو خلق اللہ کی بھلائی کی کچھ کوشش یا کم از کم اپنی بھلائی کی سعی فرمائیے۔ والسلام۔

آپ کا نیاز مند

عابدؔ

جناب! آپ مجھ سے پردۂ نسواں کے باب میں رائے طلب فرماتے ہیں۔ حضرت اس بحث وسیع کی عمومی حیثیت سے قطع نظر کر کے میں ایک

بات اس مُلک کے باب میں عرض کیے دیتا ہوں جہاں کا میں بھی رہنے
والا ہوں اور آپ بھی۔ یعنی یہ کہ ہندوستان جنّت نشان۔ عورتوں کا پردہ
تو ایک طرف۔ میری رائے تو یہ ہے کہ اگر اخلاق کی دُرستی منظور ہے تو مرد
بھی پردے میں بیٹھیں۔ شہروں کی گلیوں میں جو فحش گالیوں کی بوچھار ہر چہار
طرف سے رہتی ہے۔ خدا نہ سنوائے۔ آزادیٔ خیال کے ساتھ بے غیرتی
مشروط نہیں ہے پہلے اپنے ملک کے اخلاق کو اس درجہ پر لائیے کہ لوگ
عفت کے مفہوم کی قدر کریں اور سلف رسپکٹ کا خیال پیدا ہو۔ پھر عورتوں
کے پردے کے باب میں کلام کیجیے گا۔ انگریزوں کی مثال نہ لائیے۔ وہ
صاحبِ حکومت ہیں۔ سب ان کا رعب مانتے ہیں۔ ان کی نسواں جب
بازار میں بغیر نقاب کے نکلتی ہیں تو کوئی مزاحم نہیں ہوتا۔ ہماری عورتیں اگر
بہ طریقۂ عرب اور فارس نقاب پوش بھی نکلیں تو قیامت ہو جائے۔ مجھے
شہر کے گلی کوچوں میں خدا سے ڈرنے والے کہیں نظر نہیں آتے۔

مرزا رسوا صاحب کی رائے اس بارے میں نہایت ہی لطیف اور
معقول ہے۔ وہ پردۂ نسواں کے مخالف ہیں مگر ان کا خیال ہے کہ اس باب
میں کوئی امر اس سے زیادہ مؤثر نہیں ہے۔ بلکہ جو صاحب پردہ کے مخالف
ہیں ان کو لازم ہے کہ وہ عورت کو بے پردگی کی اجازت دیں تاکہ اور لوگوں
کے لیے ایک مثال ہو جائے۔ رفتہ رفتہ یہی طریقہ لوگ اختیار کریں اور جب
تک کوئی صاحب خود لیڈر نہ بنیں گے۔ یہ رسم قبیح دور نہ ہوگی۔ والسّلام۔

خادم الاحباب

عابدؔ

ابا جان! بعد آداب و تسلیمات کے عرض پرداز ہوں۔ میرے ساتھ کے پڑھنے والے طالب علم اکثر آپ کے افادات سے مستفید ہونے کا شوق رکھتے ہیں۔ ان مراسلات میں اکثر کوئی امر پرائیویٹ نہیں ہوتا۔ اس لیے مجھے اس میں کوئی باک نہیں ہوتا کہ اور لوگ اسے سنیں یا پڑھیں۔ یہ مراسلہ جس کا جواب میں لکھ رہا ہوں۔ میرے ایک دوست مولوی صلاح الدین ہیں۔ اے۔ نے مجھ سے لے کے پڑھا۔ ان کا خیال ہے کہ شاید آپ جینیس کے قائل نہیں۔ اگرچہ میں نے ان کو یقین دلایا کہ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ لیکن ان کو تشفی نہیں ہوتی۔ لہٰذا آپ اپنے خیالات سے اس باب خاص میں زیادہ توجہ کے ساتھ مستفید فرمائیے۔

خادم
باقر

عزیزی باقر حسین سلمہٗ۔ میری طرف سے مولوی صلاح الدین صاحب کو سلام کہنا۔ نہیں یہ بات نہیں ہے کہ میں جینیس کا قائل نہیں ہوں۔ میں نے اپنے پہلے خط میں صاف لکھ دیا ہے کہ کسی قابلیت کا حد سے زیادہ یا کم ہونا عموماً نہیں پایا جاتا۔ اوسط درجے کی صورت۔ دماغ۔ ذہن فطرت کی طرف سے ہر شخص کو عنایت ہوا ہے۔ اس عبارت سے جینیس کا انکار کہیں نہیں نکلتا۔ مولوی صلاح الدین صاحب کا خوف اس باب خاص میں قابلِ قدر ہے۔ جزاہ اللہ خیراً جزاء۔ مگر یہ بھی یاد رہے کہ میں لا زآت نیچر کو اس کے لغوی معنی میں ہرگز نہیں لیتا اور نہ کوئی عاقلِ دین دار اس کا قائل ہو سکتا ہے۔ یہ ایک عامیانہ محاورہ ہے۔ میں ہر موجودہ حادث کو ایک فاعل قادر و مختار کا

فعل سمجھتا ہوں۔ میرا یہ اعتقاد ہے کہ بس ایسا ہی ہونا چاہیے تھا جیسا کہ ہوا۔

رقیمۂ دُعا،

عابدؔ

ان خطوط کے علاوہ اور بہت سے خطوط مرزا صاحب کے نام آئے اور ان کے جواب لکھے گئے اور ہر ایک خط ان میں کسی نہ کسی مسئلۂ علمی کی بحث پر ہے۔ مگر ابھی دستیاب نہیں ہوئے اور اسی طرح وہ مضامین جو وقتاً فوقتاً انھوں نے لکھے ہیں۔ آیندہ جب دستیاب ہو جائیں گے تو ہم ان کو بطور مکاتبات مرزا عابد حسین صاحب علٰحدہ چھاپ کر شائع کریں گے۔

محسنِ قوم مرزا عابد حسین صاحب دام برکاتہٗ تسلیم! خدا آپ کی ہمتوں میں برکت دے۔ میں نے سنا ہے کہ آپ اکثر بکار آمد علموں کا ترجمہ فرما رہے ہیں۔ واقعی اس سے قوم اور ملک کو بڑا فائدہ پہنچے گا اور جیسا کہ آپ کا خیال ہے اردو زبان کی ترقی بھی اسی میں متصوّر ہے۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے۔

جس قدر کتابیں طبع ہوتی جائیں۔ اس کی ایک ایک جلد بذریعہ ویلیو پے ایبل پارسل مجھ کو روانہ فرماتے رہیے بلکہ میرا شوق تو یہ چاہتا ہے کہ جس قدر اجزا جس کتاب کے چھپتے جائیں وہ مجھ کو پہنچتے جائیں۔

اس معاملے میں آپ کے ساتھ متفق ہوں۔ جب تک علوم ہماری زبان میں نہ آئیں گے ملک اور قوم کی ترقی نہیں ہو سکتی۔ مگر ایک امر قابلِ گذارش ہے۔ اسے نہایت ادب کے ساتھ عرض کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ مجھے خوف ہے کہ یہ ترجمے جو آپ فرما رہے ہیں اور ضرور ہے کہ صَرفِ کثیر سے چھاپے جائیں۔ اس کے خریدار ملک میں بہت کم لوگ ہوں گے۔ کیونکہ ملک میں دو قسم کی درس گاہیں ہیں۔ ایک انگریزی۔ ان میں علوم انگریزی زبان

میں پڑھائے جاتے ہیں۔ دوسرے مسلمانوں کی پرائیویٹ درسگاہیں۔ اول تو ان کی تعداد بہت کم ہے۔ صرف دہلی یا لکھنؤ میں دوچار اہلِ علم اپنے گھروں یا مسجدوں میں درس دیتے ہیں۔ ان میں وہی قدیم عربی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ سالہا سال سے جو کورس مقرر ہو گیا ہے اس میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہوتا۔ اور نہ موجودہ حالت کو دیکھ کے کوئی کہہ سکتا ہے کہ ان میں کوئی تغیر واقع ہوگا۔ میں نے بھی کچھ دنوں لکھنؤ میں طالب علمی کی ہے۔ وہاں کے خیالات سے میں بخوبی واقف ہوں۔ پھر ان ترجموں کے خریدار کون لوگ سمجھے جائیں۔ پنجاب یونیورسٹی جب نئی نئی قائم ہوئی تھی تو وہاں یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ مغربی علوم بذریعہ دیسی زبانوں کے تعلیم دیے جائیں۔ مگر بعض علمائے قدیم نے بڑے زور سے مخالفت کی اور وہ مخالفتِ زمانہ کو دیکھتے ہوئے بہت بے موقع نہ تھی۔ اسی لیے پنجاب یونیورسٹی میں اورنٹیل ڈگریوں کے امیدواروں کی فہرست روز بروز کم ہوتی جارہی ہے۔ پھر آخر آپ کے ترجموں کی کھپت کہاں ہوگی۔ اگرچہ میرا ذاتی شوق یہی چاہتا ہے کہ جملہ علوم انگریزی بلکہ تمام مغربی زبانوں سے ترجمہ ہو کے اردو زبان میں آجائیں مگر یہ ایک قسم کی آرزو ہے اور ضرور نہیں کہ ہر آرزو پوری ہو۔ ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

میں نے آپ کا بہت سا قیمتی وقت ضائع کیا۔ معاف کیجیے گا بندہ کو ایک مخلص اپنا تصور فرما کے کاروبار لائقہ سے یاد فرمایا کیجیے۔ زیادہ نیاز۔

راقم

بشیر الدین احمد۔ ام۔ اے۔

از بریلی

جناب مولوی بشیر الدین احمد صاحب ام۔ اے۔ دام الطافہ تسلیم!
آپ کا خط مرسلہ آیا۔ واقعی آپ کی رائے بہت صحیح ہے۔ اور یہ امور میں پہلے ہی سمجھے ہوئے ہوں۔ مگر جب کسی امر کی خوبی متحقق ہو جائے اس کو صرف اس خیال سے کہ لوگ قدر نہ کریں گے۔ ترک کر دینا ہمت سے بعید ہے۔ اب تو یہ کام میں نے شروع کیا ہے اور خدا چاہے تو پورا بھی ہو جائے گا۔ اور رفتہ رفتہ قدر دان بھی نکل آئیں گے۔ میں نے اپنے سرمائے کا ایک جز اس مطلب کے لیے علیحدہ کر دیا ہے۔ اس سے یہ کتابیں چھاپ کر رکھی جائیں گی اور وقتاً فوقتاً بکتی رہیں گی۔ بفرض محال جو کچھ آمدنی اس کام سے ہوگی۔ اس میں میں نے اپنا کوئی حصہ نہیں رکھا بلکہ وہ اسی مقصد کے لیے صرف کیا جائے گا۔

افسوس یہ ہے کہ میں ایک قلیل البضاعت شخص ہوں۔ صرف پانچ ہزار روپیہ اس کار خیر کے لیے میں وقف کر سکا۔ چندہ مانگنا میری چڑھ ہے۔ میں اُسے بُرا نہیں سمجھتا۔ مگر یہ کام مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ جو اپنے سے ہو سکا وہ میں نے کر دیا۔ شاید آپ نے سنا ہو گا کہ میں نے وبسٹر ڈکشنری کو بھی اردو میں ترجمہ کرنا شروع کیا ہے۔ اگر یہ کام بخیر و عافیت ختم ہو گیا تو گویا کُل علوم کا ترجمہ اردو میں ہو گیا۔ اس لیے کہ شاید آپ کو انکار نہ ہو گا کہ نہ صرف مجھ کو بلکہ ملک میں اکثر صاحبوں کو مثل میرے ترجمۂ علوم کا شوق ہے۔ لیکن اکثر ترجمہ بے تکے ہوتے ہیں یا یوں کہیے کہ ہر ترجمے کا ایک جداگانہ ٹنگ ہوتا ہے۔ اس صحیح ڈکشنری کے ترجمہ ہو جانے سے ایک ذخیرہ معنوں کا (جن میں سے اکثر میری گڑھی ہوئی ہوں گی) زبان اردو میں مہیا ہو جائے گا۔ جب تک کوئی کام انجام کو نہیں پہنچتا اس کو منصوبہ سمجھنا چاہیے۔

خلاصہ یہ کہ ابھی تو یہ سب منصوبے ہیں۔ جب کوئی کام انجام کو پہنچے تو
طبیعت کو تشفی ہو۔ زیادہ نیاز۔

خادم
عابدؔ۔ لکھنؤ

مرزا رسواؔ کا خط مرزا عابدؔ حسین کے نام

مخدومی و مکرمی مرزا عابد حسین صاحب دام فیوضہٗ تسلیم!

الحمدللہ آپ کی سوانح عمری تمام ہوئی اور حسب الحکم آپ کے میں نے اس میں سے اشعار کو بالکل محذوف کر دیا۔ خطوط کی نقلیں بھی ہو گئیں۔ صرف ایک بات باقی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس سوانح عمری کا اختتام آپ ہی کے کلام پر ہو۔ لہٰذا مترصد ہوں کہ بجواب رقیمہ ہذا اس امر اہم سے مطلع فرمائیے کہ شعر و شاعری سے آپ کو اس قدر تنفر کیوں ہے؟ آپ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ میرا یہ سوال آپ سے کچھ ایسا بیجا نہیں ہے۔ اس لیے کہ میری عمر کا ایک بہت بڑا حصہ اس خبط میں بسر ہوا ہے۔ اس امر کے لکھنے کی مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے کہ آپ اپنی رائے نہایت بے تکلفی سے ظاہر فرمائیں گے۔

اس امر کی نہ کسی کو آپ سے توقع ہے اور نہ ہونا چاہیے کہ آپ کسی امر میں کسی کی مروت کریں گے۔ اس لیے کہ آپ مجھ سے بارہا فرما چکے ہیں کہ مروّت کا مفہوم عام ایک خلقی ضعف ہے اور یہ ضعف طرح

طرح کی اخلاقی برائیوں کا موجب ہوتا ہے۔

نیاز مند
رسوا

جناب مرزا صاحب تسلیم!

آپ کو میرے بعض خطوط سے جو اس سوانح عمری کے ساتھ آپ نے شائع کیے ہیں۔ معلوم ہوگا کہ میں تساوی استعداد کا قائل ہوں۔ جو خوبیاں ایک فرد بشر میں پائی جاتی ہیں۔ مع بعض قیود کے جن کا ذکر ان خطوط میں ہو چکا ہے، ان کو ہر انسان کے لیے عام سمجھتا ہوں۔ اگر میرا خیال صحیح ہے تو میں کچھ کہہ سکتا ہوں کہ میں بھی موزوں طبع اور بالقوۃ شاعر ہوں اور اسی طرح آپ بالقوۃ میکانک ہیں۔ لیکن مجھ کو بالطبع ان کاموں سے تنفر ہے جو بہت سے لوگوں کا شعار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ آپ خوب جانتے ہیں کہ میں نے اپنے بڑے لڑکے باقر سلمہٗ کی تمام امیدوں اور امنگوں کو (جو اس کے ہم عمر نوجوانوں کو بعد درجۂ فضیلت پر فائز ہونے کے عموماً ہوا کرتی ہیں) خاک میں ملا کر نہ اسے نوکری کرنے دی نہ وکالت کا امتحان پاس کرنے دیا۔ بلکہ اچھا خاصا ہردا ہا بنا لیا۔ اب وہ ماشاء اللہ زراعت کے کاروبار میں مجھ سے بہتر ہو گیا۔

دماغی ورزش کا سرمایہ بھی میں نے اس کے لیے کافی طور سے فراہم کر لیا تھا۔ اب اس کے بعض ترجمے عربی کتابوں کے انگریزی زبان میں ولایت پہنچے۔ یقین ہے کہ عنقریب شائع ہو کر آپ

تک پہنچیں۔

انگریزی کتابوں کا ترجمہ موافق اس منصوبے کے جس کو بعض عقلاء ناممکن سمجھ رہے ہیں، برابر ہو رہا ہے۔ وبسٹر ڈکشنری کا ترجمہ ہوتا جاتا ہے۔ آپ دیکھیے گا کہ اس لغت سے اُردو زبان دفعتًا کس مرتبے پر پہنچ جائے گی۔ اور علوم کے ترجمہ کرنے والوں کو کیسی سہولت ہوگی۔ اور انشاءاللہ بہت ہی جلد اس کا ثمرہ ظاہر ہوگا۔

اکثر کلوں کے نمونے جن کی ملک و قوم کو ضرورت ہے۔ ہم باپ بیٹوں نے مل کر تیار کر لیے۔ خدا نے چاہا تو عنقریب وہ دن آئے گا جب میں اپنے فارم پر ایک پرائیویٹ نمائش کر کے دنیا کو دکھا دوں گا کہ قوم کے ایک یا دو متنفس بھی عام خیالات اور عامیانہ اشغال سے باز رہ کر کے کیا کچھ کر سکتے ہیں۔

پھر اس بات کو ایک مرتبہ دُہرانے دیجیے۔ یہ سب اوصاف میرے ہی لیے مخصوص نہیں ہیں اور لوگ مجھ سے بہتر ان کاموں کو انجام دیں گے۔ اب آپ انصاف کیجیے کہ اگر ہم باپ بیٹے شاعری کی طرف جھک جاتے تو وہ غزل کہتا اور میں اصلاح دیتا مشاعروں میں غزلیں پڑھی جاتیں۔ کچھ لوگ خاطر سے واہ واہ کر دیتے تو اس سے ملک اور قوم کو کون سا فائدہ پہنچتا؟

شاعری کا شوق مسلمانوں میں ایک عرصۂ دراز سے نسلاً بعد نسلٍ چلا آتا ہے اور اس میں جس قدر ایشیائی مفہوم شعر سے ہو چکی ہے وہ ضرورت سے زیادہ ہے۔ مگر اصلی شاعری جو اہلِ یونان کا

مفہوم تھا یا عموماً اہلِ یورپ کا ہے، اس راستے میں ابھی ہمارے شعراء ایک دو قدم بھی نہیں چلے ہیں۔ ہمارے لیے وہ طریقہ بالکل نیا ہے۔ آپ کی عمر کا ایک بہت بڑا حصہ اس فن میں صرف ہوا ہے۔ اگر آپ اس کی طرف توجہ فرمائیں تو زیبا ہے۔ اگرچہ میں اسے بھی ترکِ اولیٰ کہوں گا۔ اس لیے کہ آپ خوب جانتے ہیں کہ میں بھوک سے صدمے اٹھائے ہوئے ہوں۔ اس لیے میں سب سے زیادہ ضروری ان مشغلوں کو سمجھتا ہوں جن سے اس درد کا علاج ہو۔

ایک اور بات بھی میرے ذہن میں سما گئی ہے کہ ان کمیٹیوں اور سوسائٹیوں سے کچھ ہوتا نہیں ہے۔ بہت بڑے بڑے کام شخصی محنتوں سے ہو سکتے ہیں۔ کمیٹیوں میں اختلافِ رائے اور چناں و چنیں میں بہت سا وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ میں ایک جنگجو جاہل قوم سے ہوں۔ اگر مگر سے مجھے چڑھ ہے۔ جو کام کرنا ہے اُس کو شروع کر کے تمام کرنا چاہیے۔ پرائے بھروسے سے دنیا کا کام نہیں چلتا۔

قوم میں جو لوگ ذی علم اور ذی شعور ہیں۔ وہ خود اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ ہمیں کن کن باتوں کی ضرورت ہے۔ ان میں سے کسی ایک ضرورت کے پورا کرنے کے لیے اگر ایک ہی شخص کمرِ ہمت چُست باندھ لے اور کچھ کر چلے تو بہت کچھ ہو جائے گا۔

میں نے خود ایک غلطی کی کہ بہت سے کام اپنے ذمے لے لیے۔ اگر میں خود صرف ایک ہی کام بلکہ ایک کام کے کوئی جزکی

تکمیل اپنے اوپر لازم کرلیتا تو شاید زیادہ فائدہ پہنچا سکتا۔ مگر خیر
جن چیزوں کو میں نے اختیار کرلیا ہے، میں امید کرتا ہوں کہ اس
کام کو انجام دے دوں گا۔

اب میں اس مبارک فقرے پر اپنے خط کو جو آپ کی کتاب
کا انجام ہے، ختم کرتا ہوں:

اَلسَّعْیُ مِنِّیْ وَالْاِتْمَامُ مِنَ اللّٰہِ ؕ

نیاز کیش

عابد

ISBN: 978-81-7587-543-2

₹ 62/-